یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی ٹیکسلا

النبراس

۲۰۱۳

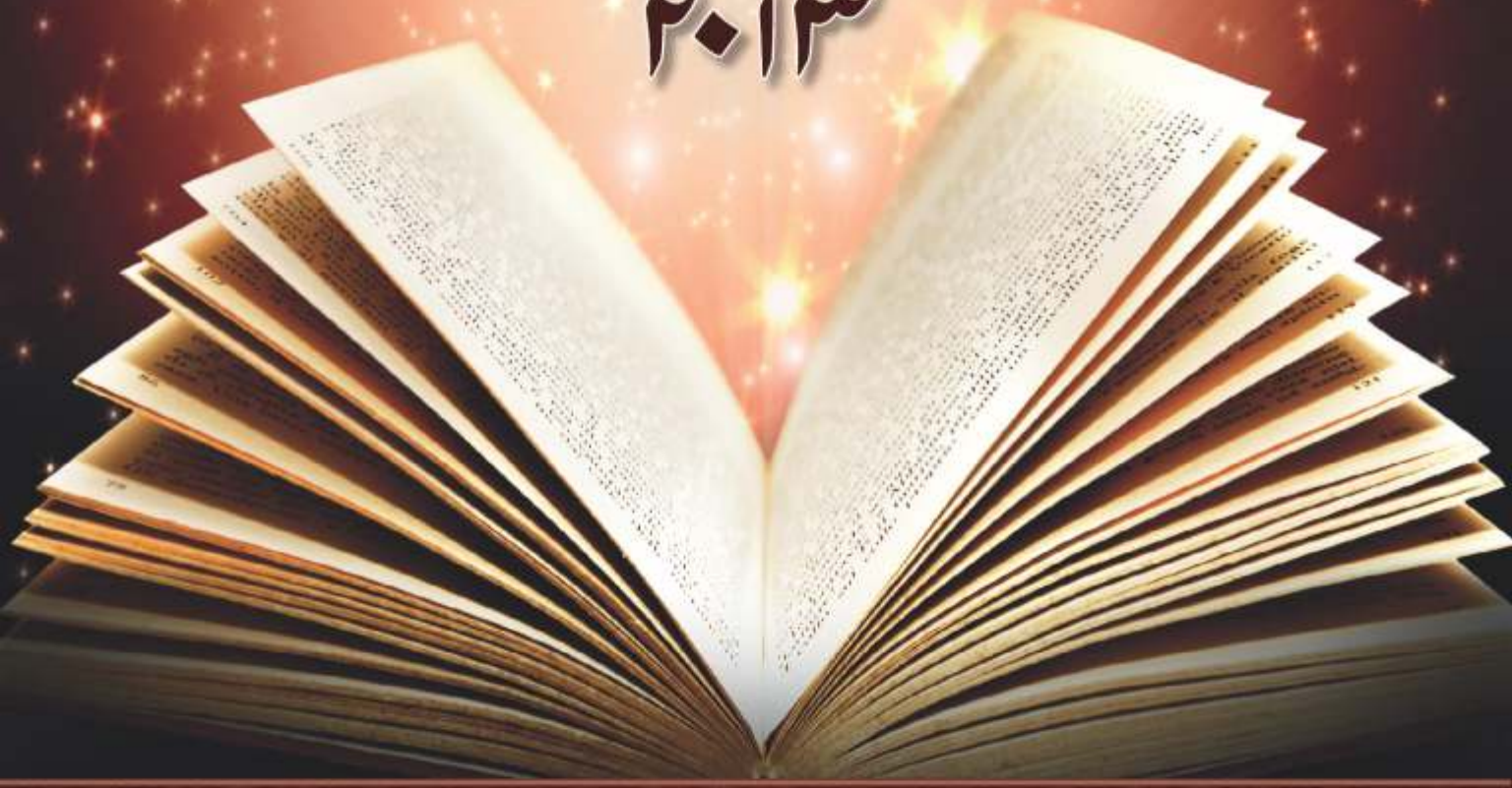

UNIVERSITY OF ENGINEERING AND TECHNOLOGY • TAXILA •

سال	جنرل ایڈیٹرز	اردو ایڈیٹرز
۲۰۰۶	ظہیر عباس	قیصر سجاد
۲۰۰۷	عمران الٰہی لاشاری	فہیم اختر
۲۰۰۸	عمران الٰہی لاشاری	مہرین کوثر
۲۰۰۹	عمران عمر لودھی	شعیب منیر
۲۰۱۰	عمار فلک شیر	شعیب اشرف طور
۲۰۱۱	حسن رضا	محمد حسن
۲۰۱۲	نعیم الحسنین	رمیض حسن
۲۰۱۳	توقیر خالد	وقاص مراتب

ٹائٹل پیج ڈیزائن

توقیر خالد (09-ME-135)

گرافکس ایکسپرٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قلم کی حُرمت اور کتاب کی عظمت کے نام

قدر و قیمت جانتے ہیں اس کی اربابِ ہنر
المہندس ہے مجلّہ اہلِ تعمیرات کا
کیوں نہ ہاتھوں ہاتھ لیں مخلصؔ اسے اہلِ نظر
بیش قیمت ہے خزانہ ایک معلومات کا

(مخلصؔ وجدانی آزاد کشمیر)

یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی ٹیکسلا

جب لوگوں پر فیصلہ کرو تو عدل وانصاف سے فیصلہ کرو۔ (فرمانِ خُداوندی)

فہرست

05 تعارف ایڈیٹوریل بورڈ ۱۳۔۲۰۱۲

08 اداریہ جنرل ایڈیٹر

10 اداریہ اردو ایڈیٹر

11 گروپ فوٹو مجلس ادارت اردو ۱۳۔۲۰۱۲

12 گروپ فوٹو آرگنائزنگ کمیٹی ۱۳۔۲۰۱۲

فکر و نظر

14 شانِ رسالت ﷺ
رابعہ اعجاز (12-SE)

16 عشق تمام مصطفیٰ عقل تمام بولہب
حافظ قاسم علی (10-EE-70)

18 بلاعنوان
اقرأ رابی شاہد (12-EE-54)

19 امت مسلمہ۔۔۔ کسی ایوبی کی منتظر
حافظ اسد الرحمان (10-CP-36)

22 فیض احمد فیض۔۔۔ امن کے شاعر
اقراء کرن (11-TE-166)

25 تعلیمی بحران۔۔۔۔اسباب اور سدباب
شہرین بخش ملک (11-EE-100)

28 اردو کا مستقبل۔۔۔۔؟؟؟
محمد فاروق (09-ME)

31 مجھے شکایت ہے
اسماء (11-TE-124)

33 ہمارا نظام تعلیم۔ترقی یا بگاڑ
حلیمہ سعدیہ (11-TE-115)

34 جعلی ادویات، سستی موت
امِ ہانی (11-SE-21)

37 لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے
مستبشرہ فاروق (10-CP)

39 پاکستانی سیاست میں خواتین کا کردار
سیدہ تحریم زہرہ (11-EE-110)

40 غذا اور غذائیت
ڈاکٹر صباحت قدوس میڈیکل آفیسر یو ای ٹی ٹیکسلا

41 حلقہء تخلیق ادب ٹیکسلا
توقیر خالد لاریب (09-ME-135)

افسانہ-کہانی

44 ''لذت آمیز درد''
وقاص رندھاوا (10-SE)

46 کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
ام ہانی (11-SE-21)

49 چاہت کے سنگ سنگ
صبا عارف (10-ME)

51 آخری پچھتاوا
محمد شبیر چوہان (10-CP)

53 پٹہ
حافظ علی رضا (10-CP)

54 قربانی
فاران حسن (10-EE-167)

56 آنسو
محمد رضوان حیدر (10-CP-52)

58 ''کاش کہ یہ خواب ہوتا!''
محمد کلیم (09-ME-137)

طنز و مزاح

62 بچے
حسن فراز (11-IE)

64 جھوٹ کی عادت نہیں مجھے
احسن عباسی (12-EE)

65 ملکہء لباس
حافظ قاسم علی (10-EE-70)

66 قلم کی حرمت
سمیرا رفاقت لائبریرین

67 میڈان چائنہ
ناصر علی مغل (10-SE-40)

69 UET سے الہندس تک
ارسلان مغل (11-SE)

73 میٹھی چٹنی، مصالحے دار شربت
بشارت عباسی میثم بخاری وی۔سی آفس UET, Taxila

75 ماسی
مستبشرہ فاروق (10-CP)

گوشہء سخن (حصہء غزل)

78	حمد باری تعالیٰ وقاص مراتب (09-EE)
79	نعت رسول مقبول ﷺ محمد شبیر چوہان (10-CP-07)
80	غزل توقیر خالد لاریب (09-ME-135)
81	غزل عطا مہروز (10-CE-05)
81	غزل عبدالوہاب (12-TE-91)
81	غزل اسداللہ زاہد (12-EE-92)
81	غزل شاہین احمد (11-TE-170)
82	غزل ضیاءالرحمٰن (09-EE)
82	غزل محمد حسن سرفراز (11-IE-47)
82	غزل محمد کاشف (10-ME-153)
82	غزل محمد احسن عباسی (12-EE)
83	غزل وجاہت عباس (10-ENV-53)
83	غزل علی حسنین (10-CE)
83	غزل عائشہ سلیم (11-SE-171)
83	غزل محمد عثمان خان (11-CP-61)
84	غزل سیدہ اسماء گردیزی (12-SE-58)
84	غزل اقراء کرن (11-TE-166)
84	غزل عثمان علی (10-ME-142)

گوشہء سخن (حصہء نظم)

86	نظم علی ارسلان (09-EE)
86	نظم عروج منظور (09-TE-19)
86	نظم طلحا اسلم (11-TE-33)
87	نظم ام ہانی (11-SE-21)
88	نظم صباء (10-ME-149)

مجلسِ اَدارت ۲۰۱۳

وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر محمد عباس چودھری
پیٹرن ان چیف

پروفیسر ڈاکٹر قیصر الزمان
چیف ایڈیٹر

توقیر خالد
جنرل ایڈیٹر

انگلش ایڈیٹوریل بورڈ

سعد ایوب حجا (انگلش ایڈیٹر)
09-ME-60

وجاہت علی
09-ME-04

ماہم راشد
09-TE-20

قاسم ضیاء
10-EE-100

سعد بن شمس
10-EE-85

علشبا کنول
10-EE-124

مشعود بن شاہد
10-EE-77

نینا اعما نوائیل
11-CP-67

زید بن فاروق
11-ME-46

شفق ملک
11-TE-93

ماہم ظفر
11-TE-96

حیاء سراسر نیکی ہے۔ (حدیثِ نبویؐ)

اردو مجلسِ ادارت

وقاص مراتب (مدیر اردو)
09-EE-119

محمد شہزاد
10-ENC-65

قاسم علی
10-EE-70

مستبشرہ فاروق
10-CP-99

حفصّہ انعم
11-TE-162

اقراء کرن
11-TE-166

احسن عباسی
12-EE

اُمِ ہانی
11-SE-21

میڈیا کلب

بلال احمد
میڈیا ایڈوائزر

محمد سفیان اکرم (میڈیا منیجر)
09-ME-90

محمد ملہان ناز
10-CE-165

سعد اقبال
10-CE-141

محمد عثمان کاکڑ
11-CP-61

نعمان لطیف
10-SE-105

نعمان آصف
10-TE-147

عبداللہ
10-CE-106

کارخانہء قدرت میں فکر کرنا بھی عبادت ہے۔ (حضرت علیؓ)

آرگنائزنگ کمیٹی

علی ارسلان
09-EE-107

صہیب انعام
09-ME-92

ایمن کاظمی
09-TE-17

رمشاء فاطمہ
10-ENV-08

عرفان خان
10-TE-15

غلام مرتضی
11-CE-187

فہد پرویز
10-CE-38

اسد علی
11-CP-63

احمد رضا
12-SE-43

معظم علی
11-SE-179

محمد حماد
11-CE

محمد انصار
11-ME-127

عمر ریاض
11-TE-95

شبیر احمد
11-TE-39

مریم
12-CE-156

رمیشہ اظہر
10-ENV-16

نایاب کیانی
11-EE-104

عمارہ شکیل
10-CP-128

مصباح رانی
10-EE-83

خدیجہ ارم
12-CE-26

کردار ایک ایسا ہیرا ہے جو ہر پتھر کو کاٹ سکتا ہے۔ (برناڈ شا)

اداریہ

میں خواب بہت دیکھتا ہوں۔ میرے خواب ہی میری تخلیق اور میرے فن کا اثاثہ ہیں یہی میرے ہونے کی گواہی ہیں اور یہی میری جستجو کی بنیاد۔۔۔۔

آج سے کئی سال پیچھے نگاہ دوڑاؤں تو مجھے گزری ہوئی ساری حقیقتیں اور مناظر بھی خواب محسوس ہوتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ خواب اس ریت کی مانند ہیں جو رفتہ رفتہ میرے ہاتھوں سے پھسل رہی ہے اور اس ریت کا ہر ذرہ کسی یاد سے منسلک ہے۔ جب سے لکھنا سیکھا ہے ادب کو اپنے چاروں اور پایا ہے۔ سکول میں منظور گیلانی صاحب سے راہنمائی ایک مشعلِ راہ بنی تو مخلص وجدانؔی اور افتخار مغل صاحب کے زانوئے تلمذ مزید مراحل طے کرنے نے فن اور فنکار کی حقیقت سمجھائی۔ پھر اس کی بعد ٹیکسلا میں آیا تو دیکھا کہ حلقہ تخلیقِ ادب ٹیکسلا کی ادبی سرگرمیوں میں فنکار کے فن کو نکھارنے کا حوصلہ موجود ہے۔ ان لوگوں میں محمد یعقوب آسیؔ، راکب راجہؔ، نوشیروان عادلؔ، محمد حفیظ اللہ بادلؔ، طارق بصیرؔ، شہزاد عادلؔ، ظفری پاشاؔ، وحید ناشادؔ، فیصل ساغرؔ، دلاور علی آزرؔ، اور شکیل شاکیؔ شامل ہیں۔ ان لوگوں سے مل کر میں نے کڑوے سچ کو میٹھے جھوٹ پر ترجیح دینا سیکھا۔ میں نے سیکھا کہ قلم ضمیر آدم کی زبان ہے اور فنکار کا اصل مذہب فن ہے اور فن محتاجِ تعارف نہیں ہوتا۔ یہ تو ان سنگتراشوں کی بستی ہے جو پتھروں کو دھڑکنیں عطا کرتے ہیں۔ لفظوں کے قالب میں جان ڈالنا تو کوئی بات نہیں۔ یہاں آ کر میں نے دیکھا کہ روشنی کی ایک چھوٹی سی لکیر کیسے اندھیرے کے سفاک سینے کو چیرتی ہوئی سفرِ مسلسل کا درس دیتی ہے اور اس سنگتراشوں کی سرزمین پر روزمرّہ کی زندگی میں بھی یہاں فن اور فنکار کے مظبوط تعلق کی مثال موجود ہے۔ اس ماحول میں مجھے المہندس سے منسوب ہونے کا موقع ملا جو یو ای ٹی میں میری پہچان بنا۔ یہاں آ کر میں علی مطہر اشعرؔ اور یعقوب آسیؔ جیسے لوگوں سے بھی ملا اور یعقوب آسیؔ کی کتاب فاعلات سے میں نے عروض کو سمجھنے میں کافی مدد لی۔

المہندس سے وابستہ چار سال میری باقی زندگی کا اثاثہ ہیں۔ چند اچھی یادیں ہیں جو ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گی۔

چند لوگ ایسے بھی ہیں جن کی رفاقت میرے لیے راہنمائی کا زریعہ بنی جن میں حسن رضا، عمار فلک شیر اور نعیم الحسنین قابلِ ذکر ہیں۔ آج بھی آنکھیں بند کرتا ہوں تو یہ بھی اک خواب لگتا ہے مگر ان سارے خوابوں کا تعلق حقیقت سے ضرور ہے۔ ان خوابوں کو الفاظ کے قالب میں ڈالنا آسان بھی نہیں ہے مگر یہ بھی اک حقیقت ہے کہ لفظوں کا اک اپنا فلسفہ ہوتا ہے۔ یقین مانیے لفظ بولتے بھی ہیں ان کی اپنے زباں ہوتی ہے اور المہندس سے وابستگی نے مجھے لفظوں کے گہرے سمندر میں اُترنے کا حوصلہ دیا۔ میری دعا ہے کہ المہندس ہمیشہ زندہ و تابندہ رہے۔

جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ (حدیثِ نبویؐ)

المہندس ۲۰۱۳ کا مجلّہ جب تک آپ کے ہاتھوں میں آئے گا اُس وقت تک ہم اس مادرِ علمی سے جا چکے ہوں گے لیکن اُمید ہے کہ آپ اس کو ضرور پسند کریں گے۔ ہم نے حتیٰ المقدور کوشش کی ہے کہ کوئی غلطی کی گنجائش نہ رہے اور آخر میں تہہ دل سے مشکور ہوں جناب محترم پروفیسر ڈاکٹر قیصر الزمان (چیف ایڈیٹر المہندس) اور محترم پروفیسر ڈاکٹر محمد عباس چوہدری (وائس چانسلر یو ای ٹی ٹیکسلا) کا جنہوں نے المہندس کے اس مجلّے کو قابلِ اشاعت بنانے میں بھرپور مدد کی۔ اس کے علاوہ علی ارسلان، وقاص مراتب، سفیان اکرم، سعد ایوب ججا، وجاہت علی، صہیب انعام، ایمن کاظمی، ماہم راشد، عرفان خان، قاسم ضیاء، نینا اعمانوائیل، علشبا کنول، رمشا فاطمہ، شہزاد، قاسم علی، شفق ملک، غلام مرتضیٰ، اسد علی، معظم شہزاد، نایاب کیانی، مصباح رانی، رِدا علی، سائرہ اجمل، عمر ریاض، اقراء کرن، حفصہ انعم، عمارہ شکیل اور دیگر تمام ممبران جن کا نام نہیں لے سکا وہ بھی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

اداریہ

آج کا مہذب اور متمدن انسان ایک عجیب صورت حال سے دوچار ہے۔اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی کوشش نے انسان کو غیر محفوظ کر دیا ہے۔زندگی تمام تر آسائشوں کے باوجود کرب مسلسل کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔انسان اپنے علم، اپنے عمل، اپنے حالات، اپنی ہی گرفت سے آزادی چاہتا ہے۔آج کے انسان کی فکری صلاحیتیں منتشر ہو کر رہ گئی ہیں۔کسی کو کسی پر اعتماد نہیں، انسان کی اپنے آپ پر اعتماد نہیں۔مستقبل واضح نہ ہو تو حال اپنی تمام تر آسودگیوں کے باوجود بے معنی نظر آتا ہے۔علم بڑھتا جا رہا ہے، پھیلتا جا رہا ہے۔لائبریریاں کتابوں سے بھری جا رہی ہیں مگر انسان کا دل سکون سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔آسائشوں کے حصول کا جنون آکاس بیل کی طرح انسان کی سوچ اور اس کے احساس کو لپیٹ میں لے چکا ہے۔رات کی تاریکی میں دور سے نظر آنے والا چراغ روشنی تو نہیں دے سکتا۔لیکن ایسی کیفیات مرتب کر سکتا ہے کہ مسافر مایوسی سے نکل کر امید تک آ پہنچتا ہے اور امید سے یقین کی منزل صرف دو قدم پر ہے۔

مدعا یہ ہے کہ یہ چند باتیں آپ کی خدمت میں پیش کر کے آپ کو یہ بتانا مقصود ہے کہ آپ کا اصل ساتھی اور آپ کا صحیح تشخص آپ کے اندر کا انسان ہے۔اسی نے عبادت کرنا ہے اور اسی نے بغاوت۔وہی دنیا والا بنتا ہے اور وہ آخرت والا۔اسی اندر کے انسان نے آپ کو جزا اور سزا کا مستحق بنانا ہے۔فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔آپ کا باطن ہی آپ کا بہترین دوست ہے اور وہی بدترین دشمن۔آپ خود ہی اپنے دشواری سفر ہیو اور خود ہی تادائی منزل۔باطن محفوظ ہو گیا تو ظاہر بھی محفوظ ہو گا۔

اپنے سکون قلب کا کچھ اہتمام کر
اس خائز خدا سے کدورت نکال دے

اپنی تحریر کے آخر میں ان تمام لوگوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔جنہوں نے اس کاوش (المہندس) کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں بھرپور ساتھ دیا اور اس تمام سفر میں زندگی کی جتنی باتیں گزری سب ایک ناقابل فراموش یاد بن کر دل و دماغ پر ہمیشہ نقش رہیں گی۔

محبت بے ضمیر کر دیتی ہے۔(شیکسپیئر)

مجلس ادارت اردو

آرزو نصف زندگی ہے اور بے حسی نصف موت۔ (خلیل جبران)

آرگنائزنگ کمیٹی

ملک کی بقاء کفر سے ممکن ہے مگر ظلم سے نہیں۔ (حضرت علیؓ)

ہمارے ذہن پہ چھائے نہیں حرص کے سائے

جو ہم محسوس کرتے ہیں وہی تحریر کرتے ہیں

جالبؔ

فکر و نظر

رابعہ اعجاز
12-SE

شانِ رسالت ﷺ

''یقیناً اللہ اور اس کے فرشتے نبی ﷺ پر درود بھیجتے ہیں۔ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! تم بھی ان ﷺ پر درود اور خوب سلام بھیجو۔ یقیناً وہ لوگ جو اللہ اور اس کو اذیت پہنچاتے ہیں، اللہ نے ان پر دنیا میں بھی لعنت ڈالی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لئے رسوا کن عذاب تیار کیا ہے'' (الاحزاب ۵۸، ۵۷)

آج کل دنیا میں اور دنیا کے مختلف ممالک میں رہنے والے مسلمانوں میں اسلام دشمن عناصر کے انتہائی گھناؤنے اور ظالمانہ فعل پر شدید غم وغصہ کی لہر دوڑی ہوئی ہے۔ اس غم وغصہ کے اظہار میں یقیناً مسلمان حق پر ہیں۔ اسلام کے دشمنوں نے آنحضرت کے متعلق جو بیہودہ فلم بنائی ہے اور جس ظالمانہ طور پر اس فلم میں آپ کے متعلق اہانت کا اظہار کیا گیا ہے اس پر ہر مسلمان کا غم وغصہ ایک قدرتی بات ہے۔ وہ محسنِ انسانیت ﷺ اور اللہ تعالیٰ کا محبوب جس نے اپنی راتوں کو امت کے غم میں جگایا، جس نے اپنی جان کو مخلوق کے تباہ ہونے سے بچانے کے لئے غم اور درد میں مبتلا کیا۔ اس عظیم محسنِ انسانیت ﷺ کے بارے میں ایسی اہانت سے بھری ہوئی فلم پر یقیناً ایک مسلمان کا دل خون ہونا چاہیے تھا۔

ہم سب کو ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہر فتح آسمان سے آتی ہے اور آسمان نے یہ فیصلہ کر چھوڑا ہے کہ جس نے رسول ﷺ کی ہتک کرنے کی وہ لوگ رسوا ہوں گے۔ اسلام نے یقیناً دنیا پر غالب آنا ہے اور غالب دلوں کو جیت کر آنا ہے کیونکہ پاک کلام کی پاک تاثیر ہوتی ہے۔ پاک کلام کو ضرورت نہیں ہے کہ شدت پسندی کا استعمال کیا جائے یا بیہودہ گوئی کا جواب بیہودہ گوئی سے دیا جائے۔ ایسے لوگوں سے خدا خود نبٹے گا۔ تجربہ بھی شہادت دیتا ہے کہ ایسے بدزبان لوگوں کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ خدا کی غیرت اس کے ان پیاروں کے لیے آخر کوئی کام دکھلا دیتی ہے۔ ان لوگوں پر اس دنیا میں بھی اللہ کی لعنت ہے۔ اس لعنت کی وجہ سے وہ زیادہ گندگی میں ڈوبتے چلے جا رہے ہیں اور مرنے کے بعد بھی ایسے لوگوں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کیا ہوا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''دوسروں کے بتوں کو بھی برا نہ کہو اس سے معاشرے کا امن برباد ہوتا ہے۔ تم بتوں کو برا کہو گے تو وہ نہ چاہتے ہوئے تمہارے سب طاقتوں والے خدا کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کریں گے جس سے تمہارے دلوں میں رنج پیدا ہوگا۔'' یہ وہ خوبصورت تعلیم ہے جو اسلام کا خدا دیتا ہے، اس دنیا کا خدا دیتا ہے، اس کائنات کا خدا دیتا ہے، جس نے آپ ﷺ کو رحمتہ اللعالمین بنا کر بھیجا۔ پس ان بیہودہ فلموں کا جواب احتجاج اور توڑ پھوڑ نہیں۔ اس بیہودگی کا صحیح جواب یہ ہے کہ اپنے اعمال کی اصلاح کی جائے اور نبی کریم ﷺ پر درود وسلام بھیجا جائے۔ دنیاوی کوششوں کے لیے مسلمان ممالک کا ایک ہونا ضروری ہے۔ ہمارا کام رسول پر درود بھیجنا ہے۔

ان لوگوں کی بیہودہ گوئیوں اور ظلموں سے اس عظیم نبی ﷺ کی عزت وناموس پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ تو ایسا عظیم نبی ہے جس پر اللہ اور اس کے فرشتے بھی درود بھیجتے ہیں۔

احسان کا بدلہ ادا کرنا اچھا اخلاق ہے۔ (امام حسنؓ)

مومنوں کا کام ہے کہ اپنی زبان کو اس نبی ﷺ پر درود وسلام سے تر رکھیں اور جب دشمن بیہودہ گوئی میں بڑھے تو پہلے سے زیادہ درود وسلام بھیجیں۔ اپنے ہر عمل سے آپ ﷺ کے خوبصورت اسوۂ حسنہ کی عملی تصویر بن کر دنیا کو دکھائیں۔ مرد، عورت، جوان، بوڑھا، بچہ اپنے ماحول کو، اپنی فضاؤں کو درود وسلام سے بھر دے۔ یہ خوبصورت عمل ہے جو ہم نے دکھانا ہے۔ اللہ تعالیٰ دنیا کو بھی عقل دے کہ وہ ظالمانہ کاموں کے کرنے سے بچیں اور ہمیں بھی اللہ اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی توفیق عطا فرماتا رہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہیں کہ ان ظالموں سے بدلہ لیں۔ انہیں وہ عبرت کا نشان بنائیں جو رہتی دنیا تک مثال بن جائے۔۔ (آمین)

سنو اے دشمنانِ دینِ احمد
نتیجہ بد زبانی کا برا ہے
محمد کو برا کہتے ہو تم لوگ
ہماری جان و دل جس پر فدا ہے

کچھ مزاحیہ!

تھرما میٹر کی اہمیت!

میاں بیوی ایک ڈاکٹر کے پاس گئے۔ بیوی کو بخار تھا۔ ڈاکٹر نے ٹمپریچر لینے کے لیے تھرما میٹر نکالا اور بیوی کے منہ میں رکھ کر کہا: کچھ دیر منہ بند رکھیے گا۔
خاوند پاس کھڑا دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ سوچ کر بولا:
"ڈاکٹر صاحب، یہ چیز کتنے کی آتی ہیں؟"

دنیا کا تمام پاگل پن محبت کی شدت پسندی کے باعث ہے۔ (شیکسپیئر)

عشق تمام مصطفیٰ عقل تمام بولہب

حافظ قاسم علی
10-EE-70

عقل اور عشق کا تقابلی جائزہ کوئی عہد حاضر کی ذہنی اختراع نہیں ہے۔ تاریخ کا بنظر غائر مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ جس روز انسان نے شعور کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا اسی روز یہ احساس اس کے اندر بیدار ہو گیا تھا کہ آیا صرف ایک ایسی قوت ہی اس کے زیر اختیار ہے جو شعور کی تمام منطقوں پر پورا اترتی ہے یا اس کے لاشعور میں کوئی قوت ایسی بھی بستی ہے جس کا حدودِ اربعہ عقل سے وسیع تر اور جس کی رسائی لامتناہی سرحدوں تک ہے۔

اس دور سے لے کر آج تک ہر دور میں چند ایک صاحبانِ منطق وفہم ضرور موجود رہے ہیں جن کا خیال ہوتا کہ جو احساس، فہم اور دلیل کی منطق پر پورا نہ اتر سکے وہ کائنات میں موجود نہیں۔ جبکہ دوسری طرف ایسے اصحاب کی بھی کمی نہیں جو ایک ایسی لاشعور قوت کا ادراک رکھتے تھے جو فہم سے بالاتر ہے اور کسی دلیل کو تسلیم نہیں کرتی۔ جو کسی منطق کی پیرو نہیں تاہم اس کا ہر جذبے سے بالاتر ہونا ہی اس کی موجودگی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اقبال کا شمار ثانی الذکر لوگوں میں ہوتا ہے۔ وہ ایسے صاحبِ عشق انسان تھے جو خود کو دیوانہ کہلواتے ہوئے فرزانگی کی تمام منازل سے آگے گزر گئے تھے۔ ان کا تمام تر فلسفہ عشق سے عبارت ہے۔ عقل اور عشق کا جائزہ اور ہمیشہ عقل کو کم تر قرار دینا اقبال کے پسندیدہ ترین موضوعات میں سے ایک ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عقل کیا ہے؟ اور عشق کیا ہے؟

عقل کس جذبے کی عکاس اور عشق کس جذبے کی روشنی ہے؟؟؟

اقبالؒ عقل کے بارے میں فرماتے ہیں۔

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے
خرد کیا ہے چراغِ راہ گزر ہے

گویا عقل قابل اہمیت جذبہ تو ضرور ہے مگر اس کی اہمیت محدود ہے۔ عقل کی رہنمائی میں چلنے سے انکار نہیں مگر کچھ حدود و قیود لگتی ہیں پھر عقل ایک خاص فاصلہ طے کرتی ہے اور پھر دست بستہ کھڑی ہو جاتی ہے اور رہنما بدلنا پڑتا ہے۔ زیرِ بحث موضوع میں ابولہب کو نشان زد کیا گیا ہے جو عقل کا پیرو ہونے پر خود کو راہِ راست پر سمجھتا تھا۔ اس کی عقل اس بات کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ ایک ایسی ہستی کی پیروی کرے جس کا بچپن اور جوانی اس کی آنکھوں کے سامنے گزرے ہوں۔ اقبالؒ نے شاید اسی لیے فرمایا ہے۔

لازم ہے کہ دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

ابولہب کی عقل اسے ''لا الہٰ الا اللہ'' کی اجازت تو دیتی تھی لیکن اس سے آگے کامل رہنما کی ضرورت تھی جو عقل نہیں ہو سکتی۔ ابولہب ایک ذہین آدمی تھا۔ اس دورِ جاہلیت میں بھی بہت کم لوگ حکمت میں اس کے ثانی تھے۔ مگر وہ عقل و دانش کو ہی سب کچھ سمجھتا تھا اور ایسے لاشعور کی کمی جو اس کے شعور کو ''جلا'' بخشتی اس کو ابولہب بنا گئی۔

عشق کیا ہے؟

گناہ کا ترک توبہ کی کلفت سے آسان ہے۔ (حضرت عثمانؓ)

ابد کے نسخۂ دیرینہ کی تمہید عشق
عقلِ انسانی ہے فانی زندۂ جاوید عشق

حضرت علامہؒ کا یہ شعر عشق کی بہترین تعریف ہے۔ اقبالؒ نے عشق کو ابد کی کتاب کا دیباچہ قرار دیا ہے اور اسی وجہ سے عقل کو فانی اور عشق کو پیہم دواں، ہر دم جواں اور جاوداں قرار دیا ہے۔ اصل میں عشق ایک ایسا روحانی جذبہ ہے جو خلقِ خدا کو پارے کی تڑپ اور آگ کا سوز عطا کرتا ہے۔ عشق ایک ایسا درخشاں آفتاب ہے جو سرچشمہ زندگی ہے۔ ایسا روشن ماہتاب ہے جو سازِ زندگی کو سوز کی لے میں بدلتا ہے جہاں سے ایسا سر نکلتا ہے جو خمارِ دیوانگی عطا کرتا ہے اور اس پردۂ دیوانگی کے پیچھے ساری افہام و تفہیم، منطق اور دلیل بے بس ہو جاتی ہے۔

عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

عشق کیا ہے؟ عشق فقیہِ حرم ہے۔ عشق ابن السبیل ہے۔ عشق کاس الکرام ہے۔ عشق خدا کا کلام ہے۔ دمِ جبرئیل عشق ہے۔ دلِ مصطفیٰ ﷺ عشق ہے۔ عملِ مصطفیٰ ﷺ عشق ہے۔ خدا کا رسول ﷺ عشق ہے۔

خاکی جسم جب اپنے عروج کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو عشق اس کو پہلی اور آخری تابنا کی بخشتا ہے۔ اس کی روشنی کا واحد ماخذ عشق ہوتا ہے۔ معرکۂ کائنات افراد کے دم سے ہے اور افراد کا دم گرمی عشق سے ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کہ عشق تماشائے ذات کا مظہر ہے۔ تاہم جو سکون و ثبات اس تماشائے ذات میں ہے وہ اس پنہاں حیات میں نہیں جو عطا کردہ عقل ہے۔ عقل اگرچہ قوتِ سوال عطا کرتی ہے جو حیات کو مضطرب تو کرتی ہے مگر اس سمندر میں جس میں غوطہ زن ہو کر قوتِ سوال کی ساری عمدگی پنہاں جواب کی آغوش میں پناہ لے لے، جہاں زندگی کا نغمہ اپنی ساری لے اور سر بھول کر آگ کی سرسراہٹ سننے پر مجبور ہو جائے، جہاں عمرِ فانی، عمرِ جاوداں کے نور میں بدل جائے، اس سمندر میں لے جانے کا واحد راستہ عشق ہے۔

کتابِ تاریخ میں بہت سی مثالیں ہمارے سامنے ہیں کہ جہاں عقل ناکام ہوئی وہاں قوتِ عشق نے کام دکھایا اور حضرت انسان کو کامیابی کا راستہ دکھایا۔ حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالنے کا واقعہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے جہاں اقبال بھی یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

نبی کریم ﷺ کی ساری زندگی خدا سے عشق سے عبارت ہے۔ صحابہ کرام کی زندگی مشعلِ راہ ہے۔ اگر وہ حضرات فرماناتِ نبوی ﷺ کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے بیٹھ جاتے تو آج شاید خدا کا دین اس مکمل حالت میں ہم تک نہ پہنچ پاتا۔ حضرت بلالؓ کو حیاتِ جاودانی عشق نے بخشی تھی عقل نے نہیں۔ حضرت اویس قرنی کا نام عقل نے سنہری حروف میں نہیں لکھا تھا، عشق کارفرما تھا۔ کربلا کے بعد اسلام کے زندہ ہونے کا مرحلہ حضرت امام حسینؓ کے عشقِ لامتناہی سے ہی آیا۔

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

غرض عشق ایسی نظرِ حکیمانہ عطا کرتا ہے جو حدیثِ رندانہ سکھاتا ہے۔ جب عقل رازِ ہستی کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوتی ہے عشق اسے آنکھوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ عقل جب ظاہر پر انحصار کر رہی ہوتی ہے عشق باطن سے آشنا ہو چکا ہوتا ہے۔

عشق میں شک کا پہلو نہیں ہے اور یقین ہمیشہ فتحِ کامل تک لے جاتا ہے اور فتحِ کامل مصطفیٰ ﷺ پر جا کر ختم ہوتی ہے۔

تازہ میرے ضمیر میں معرکہ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ ﷺ عقل تمام بو لہب

ذلت کی زندگی سے موت بہتر ہے۔ (حضرت امام حسینؓ)

اقرأ رابی شاہد
12-EE-54

بلاعنوان

موضوعِ زیرعنوان گو اتنا پیچیدہ نہیں، مگر کائنات کی ازلی اور ابدی ضرورتوں اور حقیقتوں میں سے ایک ہے۔ انسانی فطرت اور انسانی حقوق میں بنیادی اور سب سے اہم چیز آزادی ہے، آزادی کا مفہوم فقط بیڑوں اور زنجیروں سے آزاد ہونے کا نام نہیں، نہ ہی پابندِ سلاسل شخص حقیقی قید میں ہوتا ہے۔ درحقیقت آزادی تو جسم و روح دونوں کی ہوتی ہے، جب سوچ پر پہرے بٹھا دیے جائیں اور قدموں کو چلنے کی اجازت دی جائے تو یہ اس بیل کی مانند ہے، جسے ریت پر پٹی باندھ کر چلایا جاتا ہے اور وہ بیل انجانی منازل کی جانب گامزن ہو جاتا ہے، حالانکہ حقیقت میں اسکے قدم کبھی اس ریت کے چکر سے نکل ہی نہیں سکتے۔

آزادی کوئی پھول نہیں کہ باغ سے چن لیں۔ یہ دنوں یا مہینوں کی نہیں، صدیوں کی ریاضتوں کا صلہ ہے۔ آزادی کی قیمت ان سے پوچھیے، جن کے بچے اُنکی نظروں کے سامنے تہ تیغ کر دیئے گئے، جن کے پورے خاندان کو صرف پاکستان کی پاداش میں خون میں نہلا دیا گیا۔ کوئی ان سے پوچھیے جو اپنی متاعِ عزیز اس راہ میں لٹا کر راہِ عدم کے سفر پر چلے گئے، مگر ارواحیں آج بھی ان آزاد فضاؤں کو سلام دیتی ہیں۔

اس نعمت کی قدر تو ان مسافروں سے پوچھیے ، جنھوں نے ریل کے ڈبوں سے لاشوں کے سوا کسی زندہ فرد کو نمودار ہوتے نہیں دیکھا۔ جو اپنے پیاروں کی تلاش میں آج بھی سرگرداں ہیں۔ ان سے جواب مانگیے اس سوال کا جو آگ و خون کا دریا پار کر کے آئے۔ راہ کی گھاٹیوں کو اپنی لاشوں سے پاٹا اور ہندوستان کی سرزمین کو اپنے خون سے سیراب کیا۔ ان لوگوں کی قربانیوں پر نظر ڈالیے، جنھوں نے اس ملک کو اپنے خون سے سینچا۔ ان آزاد فضاؤں کے لیے اپنی سانسیں توڑ دیں۔ اس مٹی کے لیے خود کو مٹی میں مِلا دیا۔ اس روشن صبح کے لیے اپنی دُنیا تاریک کر لی۔

آج کا نوجوان وراثتِ میراثِ پدر کا اہل نہیں، وہ مغربی تہذیب کا دلدادہ ہے، یہی وجہ ہے کہ آج وہ لوگ ہمیں انتہا پسند اور دہشت گرد کہہ رہے ہیں ، جن کی وحشت و بربریت کے سامنے تاتاریوں کی روح بھی شرمائے، فقط اپنے بنیادی حق کے حصول کے جرم میں ہمیں وہ قیمت ادا کرنی پڑی، جو تاریخ عالم میں کبھی کسی نے نہ دی ہوگی۔ ہماری آج کی نسل پاکستان کے بانیوں کو خبطی کہتی ہے۔ پاکستان کی نسبت بھارت کے گن گاتی ہے۔ ان کے پاس ہر سوال کے جواب میں بس ایک یہی سوال ہوتا ہے کہ پاکستان نے ہمیں دیا کیا ہے؟ کبھی اس سوال کا جواب کیوں نہیں تلاشتے کہ ہم نے پاکستان کو کیا دیا ہے؟

یہ زندگی، یہ آزادی، یہ عزت، یہ احترام، یہ مرتبہ، یہ شناخت، یہ تشخص کیا بھارت کا مرہونِ منت ہے یا مغرب کی نظرِ التفات! آج پاک بھارت دوستی کے نعرے لگانے والوں سے سوال ہے کہ ذبیحہ گاؤ کے مسئلے پر فسادات کرنے والے ہندو، آج ہمارے دوست کیسے ہو گئے۔ مسلمانوں کو شودروں سے بھی بدتر سمجھنے والے آج ہماری طرف دوستی کا ہاتھ کیسے بڑھا رہے ہیں، ہندو برہمن کے بغل میں چھپے ہوئے نشتر کی دھار کند نہیں ہوئی بلکہ آج بھی وہ مقابل کی غفلت سے فائدہ اُٹھانے کا عادی ہے۔ مقدس سماج کے وہ بیٹے جنھوں نے ان لوگوں پہ اپنی تلواروں کی تیزی آزمانے سے دریغ نہیں کیا تھا جو ان کے لیے جان تک قُربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے، آج ہم پر وار کرنے کا ہاتھ سے کیسے جانے دیں گے۔

ہمارا مطالبہ تو فقط ایک ایسا مُلک تھا۔ جسکی جغرافیائی سرحدوں کے اندر اسلامی نظامِ حیات اختیار کیا جا سکے۔ اس ملک کی معشیت، معاشرت، تہذیب و ثقافت، رسم و رواج ہر چیز اسلام کے رنگ میں رنگی ہو۔ لیکن یہ ملک تو ایک عرصے تک سرزمین بے آئین بنا رہا۔

کیوں اس ملک کے آئین کو بار بار توڑنے کی جسارت کی گئی؟ کیوں یہ معاملہ اتنا سنگین بنا رہا؟ جب کی آئین تو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ کو ہی طے کر لیا گیا تھا۔ پھر آج تک اس ملک میں نظامِ مصطفیٰ نافذ کیوں نہیں ہو سکا؟ کیوں ہمیں مغربی نظام کے نفاذ کی ضرورت پیش آئی جو درحقیقت اسلام کے جمہوری نظام سے ہی ماخوذ ہے۔ کیا ہم آج بھی غلام ہیں؟ یا ہم واقعی آزاد ہیں؟ یا پھر ہم آزادی کی قدر نہیں کر رہے؟

موت ایک بے خبر ساتھی ہے۔ (حضرت علیؓ)

امت مسلمہ ۔۔۔ کسی ایوبی کی منتظر

حافظ اسد الرحمان
10-CP-36

کارگہ شیشہ گری چکنا چور ہونے کو ہے۔صدائے لن ترانی دیدار ساقی سے گریہ وزاری میں مصروف ہے۔ساقی ازل نالہء نیم شب کے گداز کو ترس رہا ہے ہفت اقلیم پر حکمرانی کرنے والی امت فروعی معاملات میں الجھ چکی ہے۔نوع انسانی کو نغمہ لا الہ اور درس الا اللہ کا وعظ کرنے والے مصلحین اور شیریں مقال واعظین خاموش ہو چکے ہیں۔سرحد ادراک سے راحلہء عشق عبور کرتے ہوئے گمانوں کے لشکر بھٹک کر خرافات عالم میں کھو چکے ہیں۔مغربی افکار کا کیا کہنا، تلبیس ابلیس کے شکار آج کھلے عام قانون ایزدی کو للکار رہے ہیں۔نوجوانان ملت کے فکری، ذہنی، لسانی ستون تیزی سے کھوکھلے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔کذب وافترا کے دجالوں سے زمین بھر چکی ہے۔عالم اسلام کے اقبال کا ستارہ ڈوبنے کو ہے۔طاؤس ورباب کی دھنوں میں مست امت کے سپوت شمشیر وسناں کو ترک کر چکے ہیں آج کسی ایوبی کسی ابن قاسم کے منتظر ظاہر بین کی نگاہوں سے انسانیت کی تباہی کا آخری ورق بھی الٹ چکے ہیں۔

ملت مرحوم کا شیرازہ ابتر ہو چکا ہے۔کسی قد آور رہنما کی عدم موجودگی انتہائی پیچیدہ اور مبہم خیالات کو جنم دے رہی ہے۔فرقہ واریت اور مسلک پرستی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔فروعی مسائل پر نام نہاد علمائے وقت کی مناظراتی زبان درازیوں نے روح مسلمان کی آرزوئے شہادت جیسے پائندہ افکار کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا ہے۔آج کوئی ایوبی ایسا نظر نہیں آتا جو جہاد فی سبیل اللہ کا وعظ کرنے والا ہو، جس کا مقصد احیائے دین اور اعلائے کلمۃ اللہ ہو اور جس کا شیوہ جوانمردوں کا شیوہ ہو۔

جہاں ایک طرف اپنے مسائل میں غرق امت ہے تو وہاں مغربی میڈیا کی یلغار نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اسلام دشمنی اس کی رگ رگ میں سرایت کرتی چلی جا رہی ہے۔امت کے بیٹے جس ذہنی خلفشار میں مبتلا ہیں اسے مغربی میڈیا مزید تقویت دے رہا ہے۔اسلامی اطوار اور ثقافت کا مذاق اڑایا جانے لگا ہے۔بے حیائی اور بے مروتی کا یہ عالم کہ فرزندان اسلام گناہ میں فخر اور نیکی میں عار محسوس کریں، رائج ہو چکا ہے۔اسلامی تاریخ کی مسخ شدہ صورت حال بریدہ شاخوں اور زرد پتوں کی کہانیوں میں تبدیل ہو چکی ہے۔رہی چشم بصیرت تو وہ لہولہو چشم گریہ کی صورت اختیار کر چکی ہے۔طوفان مغرب کے تھپیڑوں نے قلب مسلمان سے حیات جاوداں نکال لی ہے۔

جہاں ثقافتی یلغار نے پاؤں جما لیے ہیں تو وہاں عسکری جارحیت میں اس سے بھی بھیانک صورت حال سامنے آ چکی ہے۔پرستاران صلیب اور اسرائیل کے بیٹے امت کے لٹے پٹے قافلے کو مٹانے کے درپے ہیں۔ایک طرف کشمیر ستم کی آماجگاہ بن چکا ہے تو دوسری طرف دنیا کا سب سے بڑا بدمعاش امریکہ قریب کی سرزمین میں جنگ شروع کر بیٹھا ہے۔بوسنیا خونخوار درندوں کے ہاتھ میں ہے اور چیچنیا کے مسلمانوں کا خون پانی سے بھی ارزاں ہو چکا ہے۔لیکن ارض مقدس ۔۔۔۔۔۔۔ انبیا کی سرزمین ۔۔۔۔۔۔۔ آج پامال کی جا رہی ہے۔سانسیں تھم چکی ہیں۔لب تشنہ ہیں۔آنکھیں اسی آرزو میں ہیں کہ کوئی ایوبی ہماری مدد کو آئے اور پاک سرزمین کو درندوں کے تسلط سے آزاد کرائے۔تشدد اس انتہا کو پہنچ چکا ہے کہ ظلم بھی حیرت زدہ ہے۔معصومین ۔۔۔۔ تڑپتے بچے ۔۔۔۔ چھلنی جگر ۔۔۔۔ بارود کی بو میں رچے بسے رو رو کر فریاد کر رہے ہیں کہ اب آؤ۔ ہم گھر سے بے گھر اور وطن سے بے وطن ہو چکے ہیں۔ ہم جائیں تو کہاں جائیں؟ کس سے فریاد کریں؟ اور کسے اپنے دکھڑے سنائیں؟ کیا کوئی ایوبی ہے جو ظالموں کے تسلط سے ہمیں نکال سکے؟ اقصی ۔۔۔ اللہ کا

مردِ کامل تو وہی ہے جو دشمن کو دوست بنا سکے، (حکیم لقمان)

گھر ۔۔۔ ہائے ہائے کرتی ہوئی، سسکتی ،تڑپتی اور کراہتی ہوئی فریاد کناں ہے کہ کوئی غیرت و شجاعت کا امین کوئی ایوبی زندہ ہے تو میری مدد کرے ۔ مجھے ان ظالموں کے تسلط سے چھڑائے۔یہی اقصی آہ و زاری کر رہی ہے کفر کے تیر میرے سجدوں کے لیے بے تاب جسم کو زخمی کر رہے ہیں۔ اقصی ۔۔۔ وہی اقصی ۔۔۔ لہولہان ہے۔ویران و پریشان ہیں اور حیران ہے کہ مسلمان میری آواز سننے کے باوجود کیوں میری مدد کو نہیں آرہے؟؟

حالات کے گرداب میں پھنسی امت آج کسی ایسے ایوبی کی منتظر ہے جو امت کے سپوتوں کو گفتار کے ایوانوں سے نکال کر کردار کے میدانوں میں لا کھڑا کرے۔ جو درس اتحاد کو فروغ دے کر عدالت وشجاعت اور صداقت کا پرچار کرے۔ جو غیرت کے نام پر کفر کے جھنڈے گرادے۔ جو غفلت میں سوئی ہوئی اقوام کو مظلوموں کی ہائے ہائے سنا کر تڑپا دے اور جو رزم حق و باطل میں مومن کو صورت فولاد بنادے۔

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

وہ مجاہد ایوبی کہ شمشیر وسناں جس کا کھیل ہو۔شہسواری، تیغ زنی جس کے مشاغل ہوں۔ جو بندوقوں اور رائفلوں کی گولیوں کے طوفان میں سینہ سپر ہو سکے۔ جو معمولی نفری سے انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کا رخ بدل سکے۔ وہ ایوبی جو حوصلوں کا بدن ہو۔ جو سرابوں اور عذابوں کے ویران موسم کی طرح اپنے دشمن پر وار کرتے ہوئے انکی جرأتمندی اور غرور و تکبر کو خاک میں ملا دے اور ان کے ذہنوں پر اسلام کی عظمت کو نقش کر دے اور ستم رسیدہ انسانیت کو یہ کہنے پر مجبور کر دے کہ

نقش توحید کا ہر دل پہ بٹھایا ہم نے
زیر خنجر بھی یہ پیغام سنایا ہم نے

وہ ایوبی غازی جس کی قناعت مثل مثال ہو۔ جس کا تقوی، پرہیزگاری اور ایمانی استحکام صحراؤں کی وسعت سے زیادہ اور پہاڑوں کی سختی سے مضبوط ہو۔ جس کے گھوڑوں کی رفتار ظلم وعفریت کی آندھیوں سے بھی تیز ہو۔ جو اخلاق کی تلوار لیے لوگوں کے دلوں پر راج کرے۔ جو پاک ومنزہ صفات کا حامل ہو۔ شعائر اسلام جس کے اوصاف میں ودیعت کر دیے گئے ہوں اور جس کے جاہ وجلال اور رعب ودبدبہ سے پوری دنیا ڈرتی ہو۔ جو یہ درس پھر زندہ کرے

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

وہ جرأتمند ایوبی جو ظلم سہنے کو گناہ سمجھتا ہو۔ جو ظالم کا نشہ چور کر دے۔ جو پھر سے ارض مقدس کو ظالموں کے پنجے سے چھڑا لے۔ جو جہاد کی راہ پر چلتے ہوئے کفر کا تعاقب اس زمین کے آخری کونے تک کرے۔ جو اسلام کے علمبردار کی حیثیت سے احیائے خلافت کو فروغ دے۔ جو یہود و ہنود کو ترکی بہ ترکی جواب دینا جانتا ہو۔ جسے اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کا ڈر نہ ہو۔ جو جوانوں کو شاہینوں کا طرز اختیار کرنے پر مجبور کر دے۔

نہیں تیرا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

وہ مجاہد اعظم ایوبی جو نہ صرف اقصی کو غیروں کے تسلط سے چھڑائے بلکہ ظالموں کا زمین کے آخری کونے تک تعاقب کرے۔ جو رام کے پیروکاروں سے کشمیر کی جنت کو چھین لے۔ جو بدھ مت کے بے رحم ہاتھ کاٹ ڈالے۔ جو نصاری کے تکبر کو خاک میں ملا دے اور ظلم وستم کے ایوانوں کو راکھ کا ڈھیر بنادے۔

حلال روزی حاصل کرنا فرض ہے۔(حدیثِ نبویؐ)

جو پوری دنیا کے بے کس مسلمانوں کی فریاد بن کر آئے اور سب کی دادرسی کرے۔ جو غنڈوں کی یورش، بموں اور ہتھیاروں کی شورش سے پھوٹنے والی آتش غضب کی عفریت اور حدتوں کو ٹھنڈا کر کے رکھ دے۔ جو ایسا جلال پیدا کرے جس سے کوہ و بیابان بھی لرز جائیں۔

جلال آتش و برق سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اٹھے وہ شباب پیدا کر

وہ فاتح بیت المقدس ایوبی کہ جس پر امت رشک کناں ہو۔ گھر گھر قریہ قریہ فلسطین بن جائیں اور ٹیکنالوجی اور ترقی کے فنون میں مہارت پیدا کرنے والوں کی حد سے بڑھی ہوئی غلط فہمیاں دور کر دے۔ جو اذیتوں میں رچے اجل زدہ خواب اور ارض مقدس کی اندھی فضاؤں میں دکھ کے سراب کو اقلیم حقیقت اور باغ بہار بنا دے جو امت کے مابین انتشار کی بے جہت مسافتوں کو سمیٹ کر رکھ دے۔ اور جو یہودی سرزمین میں شفق کے سرخ دریاؤں کے مابین ہر ایک راستے پر چلنے والے ظالم و غاصب کے راستوں پر موت کے تاریک سائے مسلط کر دے۔ گویا

خون اسرائیل آ جاتا ہے آخر جوش میں
توڑ دیتا ہے کوئی موسیٰ طلسم سامری

حیف صد حیف کہ ایوبی کے منتظر ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہیں۔ امت کے رہنما جس کے ساتھ ہیں وہ اس ساتھ کی قیمت لگائے بیٹھے ہیں اور اس ساتھ میں وہ جس کے خلاف ہو گئے ہیں وہ مخالفت کا معاوضہ مانگتے ہیں۔ دونوں کی قیمت خون ہے۔ ارض مقدس میں خون کی بہتی ہوئی ندیاں ہم سے ایوبی طلب کر رہی ہیں۔ آخر ہم کب تک اس طرح غفلت میں غرق رہیں گے اور سارقوں کی خیرہ چشمی کا تماشا دیکھتے رہیں گے۔

آج عزم صمیم کی ضرورت ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ دنیا کے گنجلک اور فرسودہ نظام سے نکلنے کے بعد ہر مرد ایوبی بن جاتا ہے۔ ہر ظلم گناہ اور ہر جھوٹ سزاوار ہو جاتا ہے۔ عنقریب وہ وقت آئے گا جب ایوبی بیدار ہوگا۔ پھر وہ ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیے جائیں گے جو ظالم کا ساتھ دیں گے۔ وہ آنکھ نکال لی جائے گی جو امت کی بیٹی کو بری نگاہ سے دیکھنے کے لیے اٹھے گی۔ اور وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

ایوبی کے روحانی فرزند آج بھی زندہ ہیں۔ وہ عنقریب ہر جگہ پر ظلم کو روکیں گے۔ اور جہاد و قتال کے رستے پر چلتے ہوئے ایک بار پھر قرون اولیٰ کی یادوں کو تازہ کر دیں۔ انشاءاللہ سقیم کے منطقی مدارج میں سرگرداں امت میں صلاح الدین ایوبی پیدا ہو کر جلد ہی نجات کا باعث بنے گا۔

انشاءاللہ

حسد حاسد کو مرنے سے پہلے مار دیتا ہے۔ (بقراط)

اقراء کرن
11-TE-166

فیض احمد فیض۔۔۔ امن کے شاعر

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جان کی کوئی بات نہیں

میدانِ وفا دربار نہیں، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کی ذات نہیں

گر بازی عشق کی بازی ہے، جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

گزشتہ برس فیض کا یوم پیدائش بھارت اور پاکستان میں اُن لوگوں نے منایا جو امن کے خواہاں ہیں اور وہ اسے امن کی علامت کے طور پر یاد کرتے ہیں۔ اگر آپ عام آدمی سے پوچھیں کہ پاکستان کا سب سے بڑا شاعر کون ہے۔۔؟ تو وہ شاید الجھن میں پڑ جائے، مگر حقیقت یہ ہے کہ فیض منطق اور حقیقت پسندانہ قول و فعل کی دنیا کی ایک اور قد آور شخصیت ہے۔

فیض برصغیر کی اردو کلاسیکی شاعری کی روایت کے امین ہیں، وہ اُردو کے عظیم پانچ شعرا میر انیس میر تقی، مرزا اسداللہ غالبؔ، علامہ اقبال اور فیض..... میں سب سے آخری ہیں۔

فیض سے ایک سو سال پہلے میدان شعر کے شاہسوار مرزا غالب یقیناً اُن کے کلاسیکی انداز اور اُردو غزل میں نیا استعارہ اور مکالماتی لہجہ متعارف کروانے کی کامیاب کاوش کو سراہتے۔ چشم تصور دیکھ سکتی ہے کہ وہ دہلی کے عظیم شاعر جس نے آخری مغل دربار اور شہر کے ایرانی کلچر کو تاراج ہوتے دیکھا تھا۔ فیض کے استعارے پر دم بخود رہ جاتا'' درد آئے گا دبے پاؤں لیے سُرخ چراغ''

سیالکوٹ کے باسی، فیض نے اُردو اور عربی شمس الدین العلماء سید میر حسن سے پڑھی، گورنمنٹ کالج لاہور میں فیض پطرس بخاری سے فیض یاب ہوئے، اور انگریزی ادب میں ایم اے کیا۔ زندگی کا ایک عرصہ فیض پاکستان کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ رہے۔ اور جب وہ اس علیحدہ بھی ہوئے تو تمام عمر مارکسی خیالات کے حامی رہے۔ اُن کی شاعری، اُن کی سیاسی خیالات میں رچی بسی ہے، اور وہ اکثر پسے ہوئے استحصال زدہ آدمی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ جب اُنہوں نے پہلے پہل آمریت کے خلاف علم بلند کیا تو اُنہیں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں اور بہت سُوں نے اُنہیں سیاسی طور پر بائیں بازو کا شاعر قرار دیا۔ آج اُن

بیوقوف جب تک خاموش رہتا ہے عقلمند شمار ہوتا ہے۔ (حضرت سلیمانؑ)

کے نظریاتی مخالف اُن کے اشعار میں سکون تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔

فیض کا پہلا شعری مجموعہ ''نقشِ فریادی'' 1942ء میں منظر عام پر آیا۔ جب وہ گورنمنٹ ہیلی کالج لاہور میں پڑھاتے تھے۔1942ء تک وہ ادبی رسالے ''ادب لطیف'' کے مدیر رہے اور پھر برٹش پیپرز لمیٹڈ میں آ گئے۔ اور میاں افتخار الدین کی ولولہ انگیز قیادت میں حصہ بھی لیا اور پاکستان ''ٹائمز اور امروز'' کے چیف ایڈیٹر بھی رہے۔

فیض کی نظم ''جشن آزادی'' نے اُن کی آزادی کو وہ رُخ دیا جس نے اُنہیں لوگوں کا مطلوب بنا دیا۔ تقسیم کے نتیجے میں ہونے والے کشتِ خون نے اُنھیں اپنی بنیادوں سے ہلایا، اور پھر 14 اگست 1947ء کی رات، لاہور کی مال روڈ پر امان طلب کرتی ہوئی ایک بے نوا، بے آسرا عورت کا وہ رقصِ بسمل دیکھا، انسانیت کی اس توہین پر ان کے کنجِ لب سے وہ نوحہ پھوٹا۔ جس میں اُنہوں نے داغ داغ اُجالا اور شب گزیدہ سحر کی بات کی، چراغ سر راہ کی بے خبری، گرانیء شب میں کمی اور نجات دہدہ دل کی گھڑی نہ آنے کا گلہ کیا۔

ان کا یہ نالا دل گیر، اس وقت کے حکمرانوں کیلیئے ناقابلِ برداشت تھا۔ ''سویرا'' کا وہ شمارہ جس میں یہ نظم شائع ہوئی تھی، اس کا اشاعت پر 6 ماہ کی پابندی لگا دی۔

مجھ کو شکوہ ہے میرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے
لے گئے ساتھ میری عمرِ گزشتہ کی کتاب

اس میں تو میری بہت تصویریں تھیں
اس میں بچپن تھا میرا، قیمتی میرا عہدِ شباب

اس کے بدلے مجھے تم دے گئے جاتے جاتے
اپنے غم کا یہ دمکتا ہوا خوں رنگ گُلاب

کیا کروں بھائی یہ اعزاز میں کیونکر پہنوں
مجھ سے لے لوں میری سب چاک قمیضوں کا حساب

آخری بار ہے لو مان لو اک یہ بھی سوال
آج تک تم سے میں لوٹا نہیں مایوسِ جواب

آکے لے جاؤ تم اپنا یہ دمکتا ہوا پھول
مجھ کو لوٹا دو میری عمرِ گزشتہ کی کتاب

اس کے علاوہ فیض کے قابل رشک مجموؤں میں ''دست صباء (1958)'' اور'' زندان نامہ (1956)'' بھی شامل ہیں۔

1951ء میں فیض کو دوسرے کمیونسٹ رہنماؤں کے ہمراہ لیاقت علی خان کی حکومت کا تختہ اُلٹنے کی سازش کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا، وہ 1955ء تک جیل میں رہے۔ اُن کے اس عرصے کی شاعری اُردو ادب کے ماتھے کا جھومر ہے۔ (1958ء میں مارشل لاء کے دوران گرفتار کر لیا گیا، تب تک پاکستان سرد جنگ کے دوران مکمل طور پر امریکہ کے ساتھ وابستہ ہو چکا تھا۔)

تمہیں اس دن پر آنسو بہانا چاہیے جو نیکی کے بغیر گزر گیا۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)

متاعِ لوح وقلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دِل میں ڈبو لی ہیں اُنگلیاں میں نے
زبان پہ مہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھ دی ہے
ہر اِک حلقہء زنجیر میں زبان میں نے

فیض احمد فیض کو بہت سے نوبل اعزازت سے نوازا گیا، جن میں (1963) Lenin Peace Prize ، HRC Peace Prize ، نشانِ امتیاز (1990) اور Auicenna Prize بھی شامل ہے، اس کے علاوہ وہ چار دفعہ نوبل پرائز کے لیے بھی نامزد ہوئے۔ اس کی علاوہ فیض پر بہت سی کُتب لکھی گئی جن میں فیض یادیں، باتیں (احمد سلیم)، فیض شاعری اور سیاست (فتح محمد ملک)، تیری یادوں کے نقوش (شاکر حسین شاکر)، ہم جیتے جی مصروف رہے (آغا ناصر) اور مکالمات فیض (خلیل احمد) شامل ہیں۔

آج فیض ہمارے ساتھ نہیں، لیکن اُن کی لکھی شاعری (کلام) کو آج بھی پڑھے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ یہیں کہیں ہمارے آس پاس ہیں، اور وہ اپنی شاعری کے ذریعے ہمیشہ زندہ رہے گے۔

دونوں جہاں تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے

کچھ مزاحیہ!

شادی کی تقریب میں جن آ گیا۔
جن کو دیکھتے ہی لڑکیوں کی چیخیں نکل گئیں۔
ایک باباجی نے لڑکیوں کو وضو کرنے کو کہا۔
لڑکیاں وضو کر کے آئیں تو۔۔۔۔۔
جن کی چیخیں نکل گئیں

نعمت کا ملنا آزمائش ہے کہ تم شکر کرتے ہو یا ناشُکری۔ (فرمانِ خُداوندی)

تعلیمی بحران۔۔۔اسباب اور سدباب

شہزین بخش ملک
11-EE-100

مملکت خداداد پاکستان میں پچھلے سالوں سے یونیورسٹیز اور کالجز کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔لیکن اس کے باوجود نظام تعلیم روبہ زوال ہے۔اور آئے روز اس نظام تعلیم سے پیدا ہونے والی اخلاقی گراوٹ کا مظاہرہ سامنے آتا ہے۔بجائے اس کے کہ مرض کے اصل سبب کا پتہ لگایا جائے،نت نئے تجربات نے ہمارے تعلیمی نظام کی کمر توڑ رکھی ہے۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے اس نظام تعلیم کی خرابی کے اصل محرکات کیا ہیں اور کیا وجوہات ہیں کہ بہترین ادارے ہونے کے باوجود ہمارا یہ نظام تعلیم ہمیں طبقاتی تقسیم اور انتشار میں مبتلا کر رہا ہے اور ملکی اور ملی ترقی میں کوئی قابل ذکر کردار ادا کرنے سے قاصر ہے اور اس سب سے بڑھ کر یہ کہ اس سب کا علاج کیا ہے؟

ان تمام چیزوں پر روشنی ڈالنے سے پہلے میں آپ کو یہ یاددہانی کروانا چاہتی ہوں کہ مملکت اسلام کے نام پر وجود آئی تھی اور اس کے لیے ہزاروں مسلمانوں نے صرف اس لیے قربانی دی تھی کہ ہم آزاد ملک میں اپنی اسلامی اور دینی اقدار کی حفاظت کر سکیں گے۔ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ قیام پاکستان کے بعد،پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کے نعرے کو عملی شکل دی جاتی اور یہاں پر ایک ایسا نظام وضع کیا جاتا جو طبقاتی تقسیم پیدا کرنے کی بجائے وحدت مسلم کا سبق دیتا جو سندھی،بلوچی،پنجابی اور پختون کی بجائے ایک مسلم برادری کا پرچار کرتا اور اس نظام سے فارغ التحصیل نوجوان صحیح معنوں میں اسلام کی آفاقی تعلیمات کو سمجھتے اور پوری دنیا میں عام کرنے کے لئے عازم بہ سفر ہوتے۔

مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے ملک پر ہمیشہ سے ہی مفاد پرست ٹولہ قصر شاہی پر قابض رہا ہے۔جس کے نزدیک اس عظیم ملک،یہاں کی عوام،حتیٰ کہ اسلام کی بھی کوئی اہمیت نہیں اور بدقسمتی سے ہمیں چند ایسے دانشور بھی میسر آ گئے جنہوں نے اپنی نفسیاتی خواہشات کی تکمیل کے لئے ہمارے دینی معاشرے اور نظام تعلیم کے درمیان ایسی کشمکش کا آغاز کر دیا جس نے ذلت اور رسوائی کے علاوہ شاید ہی کچھ دیا ہو۔

مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ وہ کبھی بھی جدید علوم میں پیچھے نہیں رہے بلکہ موجودہ زمانے کے مروجہ جتنے بھی علوم ہیں مسلمان انکے بانی رہے ہیں اور آج بھی یورپ کی یونیورسٹیوں میں مسلمانوں کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔حقیقت یہی ہے کہ مغرب کے پاس آج جو مادی وسائل ہیں اور انکی گلیوں میں جو آج روشنی نظر آ رہی ہے وہ ساری کی ساری مسلمانوں کی مرہون منت ہے۔مسلمانوں نے علمی اعتبار سے عروج کا زمانہ اسی وقت پایا جب انکے سامنے ایک مقصد تھا۔انکے تعلیمی نظام میں مقصدیت تھی۔ان کا تعلیمی نظام فرد اور معاشرے کو جوڑتا تھا۔اور انکے دل و دماغ اسلام کے آفاقی مقصد اور اوعلائے کلمتہ اللہ کے لیے پوری طرح تیار ہوئے تھے۔اسی لیے یہود و نصاریٰ نے جہاں جہاں نوآبادیاتی نظام کے تحت حکومت کی وہاں سب سے پہلے اسی مقصدیت کو ختم کیا گیا۔اور ہمارے اینگلو انڈین قسم کے سکالرز لارڈ میکالے کے پیچھے اندھا دھند بھاگتے اور قوم کو بھگاتے اس مقام پر لے آئے ہیں کہ وہ اپنے آخری دموں پر ہے۔اور اس سے آگے تباہی اور بربادی کا لامتناہی سلسلہ ہے۔

اس لیے اگر ہم اپنے تعلیمی نظام کے بحران کے اسباب پر غور کرنے لگیں تو سب سے پہلے ہمیں اس بات کی فکر کرنا ہوگی کہ ہمارے تعلیمی نظام کا اصل مقصد کیا ہے۔مشہور انگریزی ماہر تعلیم Prerrcy Neiinn نے نظام تعلیم کے مقصد کے اوپر روشنی ڈالی ہے۔

انسان کا سب سے بڑا دشمن اس کا پیٹ ہے۔(حضرت علیؓ)

تعلیم کا بنیادی خیال جو پوری نظام تعلیم پر حاوی ہونا چاہیے یہ ہے کہ تعلیم اس کوشش کا نام ہے جو بچوں کے والدین اور سرپرست اس نظریہ حیات پر جس کا عقیدہ رکھتے ہیں، اپنی نسل کو تیار کرتے ہیں۔ نظام تعلیم کا فریضہ یہ ہے کہ وہ ان روحانی طاقتوں جو اس نظریہ حیات سے وابستہ ہیں، طالب پر اثر ڈالنے کا موقع دیں اور وہ طالب علم کی ایسی تربیت کرے جو اس قوم کی زندگی کے تسلسل اور ترقی میں طالب علم کی دستگیری کرے اور وہ اس کے ذریعے مستقبل کا سفر جاری رکھ سکیں۔

میں ان سب دانشوروں، صحافیوں، ماہرین تعلیم سے دست بستہ عرض کرتا ہوں کہ وہ اس حقیقت کو سمجھیں۔ کیا ہم نے غیروں کے نظام تعلیم کو اپنا کر اپنے ہی افراد کے درمیان ایک ایسی گہری خلیج پیدا نہیں کر دی، جس کا نتیجہ ذلت اور گمراہی کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ ہمارا نظام تعلیم تو ایسا ہونا چاہیے تھا کہ جو ہمارے افراد اور دینی اقدار کے درمیان ایک رشتہ قائم کرتا۔ اس سے نکلنے والا ایک ایک فرد کندن بن کر نکلتا۔ اسے اللہ واحد پر کامل یقین ہوتا۔ اور وہ اپنے شکم اور جسم کی سوچ سے ہٹ کر ملک اور ملت کے لیے بھی سوچتا۔ اگر غیروں کے نظام تعلیم نے ہمارے معاشرے اور افراد کے درمیان ایسی خونریز کشمکش کو جنم دیا ہے جو اگر افراد کے درمیان ہوتی تو شاید اتنی خطرناک نہ ہوتی مگر وہ حدود سے آگے بڑھ کر ملت کے میدانوں میں داخل ہو چکی ہے۔ اسی وجہ سے ہماری پوری قوم کو ایسے درد کا سامنا ہے کہ باصلاحیت نوجوان ملک اور ملت کے لیے میدان عمل میں آنے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔ آپ دیانتداری سے غور کریں کہ نرسری میں پڑھنے والے بچے سے یونیورسٹیز کے ڈگری ہولڈرز تک کیا سوچ پروان چڑھ رہی ہے اور کیا یہ سوچ ہمارے دینی معاشرے اور ہمارے ملک اور جس مقصد کے لیے یہ ملک حاصل کیا گیا اس کا مقصد ہماری اقدار سے مطابقت رکھتا ہے، تو ہم نفی میں جواب دیں گے ایک نوجوان جب اس نظام کے اندر قدم رکھتا ہے تو سب سے پہلے اسے اس کے سٹیٹس کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ پھر اس کے حصول کے لیے اسے معاشی حیوان بنایا جاتا ہے۔ اسے خدا پرستی کے بجائے خود پرستی سکھائی جاتی ہے اسے مادیت پرستی کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے دل سے اسلامی جزبے کو سرد کرنے کے لیے اسے مغربی ثقافت اور تہذیب میں رنگا جاتا ہے جبکہ وہی نوجوان جب ان اداروں سے نکلتا ہے تو اسے سب سے پہلے اپنے معاشرے، دینی اقدار اور اپنے اسلاف کا بالکل الٹ پہلو نظر آتا ہے تو وہ ایسی دماغی الجھن میں مبتلا ہوتا ہے کہ جو صلاحیتیں ملک اور قوم کے لیے استعمال ہونی تھی اس خونریز جنگ میں صرف ہو جاتی ہیں۔

اس لیے ہمارے تعلیمی نظام کے مقاصد کو واضح کرنا ہوگا اور اصل مرض کی طرف توجہ دینا ہوگی۔ سیکولر نظام تعلیم کی بجائے، مملکت پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں ایسا نظام وضع کرنا ہوگا جو ہمارے افراد اور معاشرے کے درمیان اک پل کا کام دیں تب ہم کہہ سکیں گے کہ ہم نے اس ملک اور قوم کی خدمت کی ہے۔

ہماری آزادی کو ۶۷ سال گزر چکے ہیں مگر آج تک یہ سمجھ نہیں آسکا کہ ہمارے لیے اچھا اور برا ہے۔ کبھی ہم مسلمان بننے کی کوشش کرتے ہیں تو کبھی مغربی معاشرے کی نقالی کرتے نظر آتے ہیں اور یہ صرف ہمارے رہن سہن تک نہیں ہے بلکہ ہمارا تعلیمی نظام بھی اس سے آلودہ ہو چکا ہے۔، ہم آج تک یہ طے نہیں کر پائے کہ ہمارے تعلیمی زبان اردو ہونی چاہیے یا انگریزی۔ قومی زبان اردو ہونے کے باوجود ہمارے ہاں تعلیمی نظام انگریزی پسند کیا جاتا ہے۔ آخر ہمیں ایسا کونسا احساس کمتری ہے جو ہمیں اپنی قومی زبان سے جدا کر رہا ہے۔ بدلتے نصاب نے بچوں کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔۔ جسے نہ تو بچوں کا کچا ذہن قبول کرتا ہے اور نہ ہی وہ اس نصاب کے ساتھ سمجھوتہ کر پاتے ہیں۔ پاکستان میں تعلیمی نظام کو سنبھالنے کا کام وزارت تعلیم اور صوبائی حکومتیں کرتی ہیں جب کہ فیڈرل گورنمنٹ کا کام تعلیم کے حوالے سے ان دونوں حکومتوں کی مدد اور ریسرچ کی فراہمی کا ہے۔ ہمارا نظام تعلیم بنیادی طور پر پانچ ادوار پر مشتمل ہے۔

پرائمری: ایک سے پانچ تک۔

مڈل: چھے سے آٹھ تک۔

سیکنڈری: نو سے دس تک۔

بے ادب خالق و مخلوق دونوں کا امعتوب ہے۔ (حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ)

انٹرمیڈیٹ: گیارہ سے بارہ تک۔

ہائرایجوکیشن: تیرہ سے سولہ اوراس سے اوپر آگے تک۔

اورتمام ادوار میں طلباء شدید مشکلات کا سامنا کرتے ہیں۔حکومت کا یہ قدم بہت احسن ہے جس میں انہوں نے پرائمری تک مفت تعلیم کردی ہے۔لیکن یہ شہروں کی حدتک ہے پسماندہ علاقوں میں بالکل نہیں۔ ہمارے ملک میں آج بھی کچھ علاقوں میں لڑکے اورلڑکیوں کی تعلیم میں فرق روارکھا جاتا ہے اوراس کے لیے حکومت کوئی شرط نہیں عائد کرپارہی ہے۔ بلوچستان میں تو یہ صورتحال بہت خراب ہے اورحکومت اس معاملے میں بے بس نظر آتی ہے۔ ہماری درسگاہوں کے حالات بھی بہت خراب ہیں سٹوڈنٹ پولیٹکیس نے تو بیڑہ غرق کردیا ہے۔ جہاں نہ تو اساتذہ کی عزت کی جاتی ہے اورنہ تعلیم کی فراہمی۔

ہمارا تعلیمی معیار بھی بہت خراب ہے اور دوسرا اساتذہ کی کمی۔

اس کے علاوہ ہمارے ملک میں تعلیم پانچ درجوں میں فراہم کی جاتی ہے جوطلباء فیس ادانہیں کرسکتے ان کے پاس اورکوئی انتخاب نہیں ہے اوروہ جواچھے خاندانوں سے تعلق رکھتے ھیں وہ اچھے سکولوں میں پڑھتے ہیں جس سے غریب کے بچوں میں احساس کمتری پیدا ہوتا ہے۔

اس کا حل یہ ہے کہ حکومت اس معاملے پہ ایک حکمت عملی بنائے جس کے تحت وہ ملک میں تعلیمی بحران پہ قابو پاسکے اس میں درج ذیل سفارشات ہیں۔

۱: تعلیم کی فراہمی کے ساتھ ساتھ پسماندہ علاقوں میں لڑکے اورلڑکیوں کی برابر کی تعلیم کو یقینی بنایا جائے اس کے علاوہ گاؤں کی سطح پر اچھے اساتذہ کا انتظام کیا جائے اورانکی نگرانی کی جائے۔

۲: معیارتعلیم کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی تربیت کا بھی جامع پروگرام بنایا جائے۔ان کے لیے تعلیمی سرٹیفکیٹس جاری کیے جائیں تاکہ قابل لوگ سامنے آئیں۔

۳: بار بار تعلیمی نصاب کو بدلنے کی بجائے ایک جامع نظام لایا جائے جوکم ازکم پانچ سال تک پڑھایا جائے اسی طرح سارے نصاب کوانگلش اور پھراردو کی بجائے لازمی مضامین کواردواور باقی سب انگلش میں کردیا جائے اورسارے ملک میں ایک جیسا نصاب تعلیم نافذ کیا جائے۔

۴: نصابی سرگرمیوں کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا کے قیام سے بھی نصاب میں مدد لی جائے تاکہ طلباء ایسی چیزوں کے غلط استعمال کی بجائے ان کا مثبت استعمال سیکھ سکیں۔مینوئل سسٹم کوالیکٹرانک میں بدلا جائے تاکہ طلباء کو بیرون ملک پریشانی نہ ہو۔

۵: تمام نصابی سرگرمیوں سے ہٹ کرروایتی مضامین کی بھی حوصلہ افزائی کی جائے جیسے فیشن ڈیزائن اورڈیکوریشن وغیرہ۔تاکہ طلباء میں ایسے مضامین کی دلچسپی بڑھے وروہ دوسری سرگرمیوں میں بھی اپنی صلاحیتیں منواسکیں۔

ان تمام سفارشات پرعمل کے ساتھ ساتھ ایسے مضبوط لائحہ عمل کی ضرورت ہے جس سے ہمارے ملک میں تعلیمی معیار کو بہتر کیا جاسکے اس کے لیے حکومت کو جنگی بنیادوں پراقدامات کرنے چاہیے اورہماری آنے والی نسلوں کا مستقبل محفوظ بنانا چاہیے۔

جب عالم زاہد نہ ہوتو وہ اپنے ماننے والوں پرعذاب ہے (حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ)

محمد فاروق
09-ME

اردو کا مستقبل۔۔۔۔؟؟؟

ہندوستان قدیم زمانے سے بیرونی اقوام کی تگ وتاز اور توجہ کا مرکز رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں یہاں مختلف تہذیبیں پروان چڑھیں اور انہوں نے مقامی ثقافت میں مدغم ہوکر نئے اور خوبصورت ثقافتی رویوں کو جنم دیا۔چنانچہ خطے میں موجود مختلف اقوام کی تہذیبوں کی اور زبانوں کے ملاپ کے ارتقائی اور تدریجی عمل سے ہماری خوبصورت زبان 'اردو' کی تشکیل ہوئی۔اگرچہ یہ ہندوستان کی مشترکہ زبان تھی مگر عربی اور فارسی کے گہرے اثرات نیز عربی رسم الخط میں ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کا اس سے غیر معمولی لگاؤ بلکل فطری تھا۔

مغلیہ دور میں حکومت میں سرکاری سرپرستی حاصل ہونے کی وجہ سے دیگر علوم وفنون کی طرح چمنستان اردو کے بیل بوٹوں پر بھی خوب برگ وبار آیا۔ ادبی،علمی،سائنسی اور مذہبی مشاغل میں فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کے استعمال سے اس کا دامن اظہار اور مجموعۂ الفاظ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ حتٰی کہ مغلیہ عروج کے آخری دنوں میں بقول حضرت داغ صورت حال یہ آ گئی۔۔۔۔

اردو ہے جس کا نام ہم جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

دور غلامی اور اس سے بیشتر 'زمانہ نیم غلامی' میں بھی ترقی کا یہ سفر رکا نہیں۔ بلکہ عجیب امر ہے کہ اس عرصہ ظلمات میں انیس، غالب، اقبال، ابوالکلام، حالی اور شبلی جیسے نابغہء روزگار تخلیق کارواں نے نہ صرف عالمی معیار کا ادب تخلیق کیا بلکہ خطوط غالب کی سلیس نثر، حالی کی ادبی اصلاحات، شبلی کے مقالاتی انداز اور بابائے اردو کے دالرجمہ کی خدمات نے اردو کو قریب قریب اس قابل کر دیا کہ جدید علوم کی تدریس، تحصیل، اور تحقیق اردو میں ہی ممکن ہوسکتی، بابائے اردو کی کوششوں سے کئی ملکوں کے جامعات میں شعبہء اردو کا اجراء ہوا۔

پھر پاکستان بن گیا۔۔۔۔۔۔مسلمان آزاد ہوگئے۔۔۔۔۔۔اور اردو ہماری دفتری اور قومی زبان بن گئی۔

مقصد مضمون صرف اس قدر ہے کہ سنجیدہ قارئین اور طالب علم ساتھیوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ ہماری کوتاہ بینی، لاپروائی اور بلاوجہ احساس کمتری کی وجہ سے ترقیء اردو کا یہ عمل (جو دور غلامی میں بھی جاری رہا) آج بڑی تیزی سے رویہء زوال ہے۔

ان سطور کا مقصد اس خطرناک صورت حال کے ادراک کی دعوت اور قومی زبان کی ترجمانی کے سواء کچھ نہیں۔۔۔۔۔

اردو کو لاحق خطرات کو سمجھنے کے لیے ہمیں ایک دفعہ پھر ماضی میں جھانکنا پڑے گا۔اردو کی اٹھان اور جوبن ہندوؤں کیلئے ناقابل برداشت تھا، ان کے نزدیک اردو کی مقبولیت کا مطلب تمدن اسلام کی آبیاری اور اس کا پھیلاؤ تھا چناچہ برطانوی قبضے کے دوران کھل کر کھیلنے کا موقع ملتے ہی بنارس کے ہندوؤں نے اردو ہندی تنازعہ کھڑا کر دیا جسے مسلمانوں کی پرزور مزاحمت نے کامیاب نہ ہونے دیا۔

نظر اس وقت تک پاک ہے جب تک نہ اُٹھائی جائے۔(بوعلی سینا)

اسی عرصہ میں انگریزوں نے اپنی سازشی ذہنیت کے عین مطابق اردو پر ایک بہت ہی گہرا وار کیا۔ یہ وار اردو کیلئے رومی رسم الخط کی ترویج تھا۔ اسو کیلئے ادارے بنے، رقوم مختص ہوئی اور خواص کو قائل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن مسلم زعماء اور عوام نے اس کو قبول نہ کیا۔ ادھر عالمی جنگوں میں الجھے ہونے کی وجہ سے ولایتی شہ دماغ اس مقصد پر پوری توجہ نہ دے سکے۔ نتیجتاً انگریز کا یہ وار خالی چلا گیا۔۔۔

واضح رہے کہ رومی طرز تحریر سے مراد الفاظ و محاورات اردو کو انگریزی حرُوف تہجی میں لکھنا ہے، یہ بعینہ وہی صورت حال ہے جسے آج ہم بغیر کسی دباؤ کے اپنے موبائیل فون پیغامات اور انٹرنیٹ کے برقی رابطوں کے ذریعے خود بخود اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ بلکہ اب تو رجحان آہستگی سے پھیل رہا ہے اور کبھی کبھار نوٹس بورڈ پر زندہ دلی کا کوئی نہ کوئی ایسا نمونہ نظر آتا ہے:

"yr lib me meri usb PC se lagi rah gai ha js ko miley plz txt kr de...."

'نیا جال لائے پرانے شکاری' جیسی صورت حال ہے۔۔۔۔۔۔۔حاسدین اردو کا نامکمل یا ناکام منصوبہ آج خود ہمارے اپنے ہاتھوں سے پایہ تکمیل تک پہنچتا دکھائی دے رہا ہے۔۔۔۔۔(خاکم بدہن)۔۔۔

سطور بالا کا محرک یہ فون یا بدگمانی نہیں کہ خدانخواستہ اردو فنا یا بے اثر ہونے والی ہے بلکہ ہم تو اس کے تابناک مستقبل کے منتظر ہیں کیونکہ ہمارے پاس اسکے لیے محبت اور کوشش کے جذبے کے علاوہ 'اردو سائنس بورڈ' اور 'اکادمی ادبیات' جیسے ادارے موجود ہیں۔۔۔۔۔تاہم یہ بات یقیناً ہر آدمی تسلیم کرے گا کہ رائج الوقت نظام تعلیم میں میٹرک کے بعد عرصہ تک یہ نوبت نہیں آتی کہ اردو کا ایک صفحہ بھی تحریر کرنے کی ضرورت پڑے۔۔یہی وجہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے بیشتر طلباء ڈگری مکمل کرنے کے بعد معیاری اردو لکھنا تو کجا سمجھنے کی صلاحیت سے بھی بے بہرہ ہو جاتے ہیں۔۔۔راقم کئی دفعہ بذات خود اس صورت حال کا مشاہدہ کر چکا ہے۔۔۔۔۔کیا یہ ایک خطرناک صورت حال نہیں؟؟؟

سوال یہ ہے کہ زبان اگر کوئی الہامی شے تو ہے نہیں، پھر اسکے بدل دینے سے کیا ہو جائے گا؟؟؟

اس اعتراض کے جواب کے لیے۔۔۔۔۔۔۔۔ایک دفعہ پھر ماضی سے ہی مثال عرض ہے۔

یاد کیجیے کہ تحریک پاکستان کے کے دوران قائداعظم کی طرف سے ہر دفعہ مسلمانوں کے جداگانہ تشخص اور بحیثیت قوم اپنی علیحدہ پہچان پر ایک دفعہ بھی کوئی سمجھوتہ نہیں کیا گیا۔

کسی قوم کی علیحدہ پہچان چند خصوصیات کی مرہون منت ہوتی ہے جن میں پہلی خصوصیت اس کا مذہب (جیسا کہ دوقومی نظریے میں کہا گیا ہے) اور دوسری اس قوم کا تمدن ہے۔۔۔۔اور تمدن کی تمام شاخیں زبان ہی سے پھوٹتی اور پھیلتی ہیں۔ اب اردو کو انگریزی میں بدل دینے کا مطلب تمدن کی بنیادوں کی تبدیلی ہے جس سے معاشرے کے اندر عرب و فارس سے بذریعہ آنے والے رواجوں، رویوں اور نظریات کے بجائے یورپ و امریکہ سے آنے والے کلچر جڑ پکڑ لے گا۔۔۔۔۔اس کا لازمی نتیجہ ہوگا کہ ہم جداگانہ تشخص کو گنوا کر دوقومی نظریے کے مجرم بن جائیں گے۔

ہمارا تمام تر سرمایہ اردو۔ عربی اور فارسی زبانوں میں ہے۔ ہمارا مذہب اور قانون، افسانہ اور ناول، شعری ذخیرہ، آرٹ اور کلچر، عروج کی داستان اور زوال کے نوحے، اسلاف کے کارنامے، جنگیں اور صلح نامے سب کے سب انھی زبانوں میں ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں جو کسی قوم کے قبلے کے رخ کا تعین کرتے ہیں۔

ان زبانوں کو چھوڑنے کا مطلب ماضی کی روایات سے بے خبری اور علمی سرمائے سے محرومی ہے جس کے بعد ہماری حیثیت کٹی ہوئی پتنگ سے مختلف نہ ہوگی۔

یہ پہچان اور تشخص بہت ضروری ہے۔ اگر ہم کسی اور قوم میں ضم ہونے کی خواہش کریں گے تو نہ صرف عزت جائے گی بلکہ یوں گر پڑنے کے بعد ہمیں کوئی قبول بھی نہیں کرے گا۔۔۔۔۔ بال ٹھاکرے ساری عمر چلاتا رہا کہ مسلمان تو عرب سے آئے ہیں، اگر ہم نے بھی اپنی دینی اور تمدنی پہچان برقرار نہ رکھی ہوتی تو معتصب ہندوؤں کے اس دعوے کے بعد ہم کہاں کھڑے ہوتے؟ ترکوں نے اتحادیوں کے جھانسے میں آ کر خلافت کا خاتمہ کر ڈالا مگر کسی نے انھیں 'یورپی یونین' میں شامل نہ کیا، مائیکل جیکسن کئی مرتبہ سرجری کروانے کے بعد بھی خود کو گورا نہ کہلوا سکا!!!

اسلامی اندلس پر قبضہ کرنے کے بعد عیسائیوں نے مقامی مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنالیا مگر اس کے باوجود ان مظلوموں کو کئی صدیوں تک عیسائیوں کے حقارت آمیز القابات سہنا پڑے۔۔۔۔۔ بلکل اسی وقت 'کلچرل فیوژن' کے حوالے سے ان کا اپنا ردعمل بلکل مختلف تھا، انہوں نے غرناطہ اور قرطبہ کے کتب خانوں میں موجود علمی سرمائے کے ایک ایک حرف کا ترجمہ کر ڈالا مگر مسلمانوں کی زبان اور لباس کو بالکل اختیار نہ کیا۔۔ عربی کتب کو یورپی زبانوں میں منتقل کرنے کیلئے بڑے بڑے ادارے بنے جن میں مسلسل تیس سو سال تک علوم کے ترجمے اور اصطلاحات کی تدوین کا کام ہوتا رہا۔۔۔ انکے لیئے بہت آسان تھا کہ طلبہ کو عربی سکھاتے اور نہ صرف ترجمہ کی زحمت سے بچے رہتے بلکہ اصل ذخائر سے براہ راست استفادہ بھی کر سکتے تھے مگر انکے شہ دماغ جانتے تھے کہ اگر عربی کو بطور زریعہ تدریس اختیار کیا گیا تو یہ اپنی روایات، اصطلاحات، اثرات اور اُصول ساتھ لے کے آئے گی۔۔۔ کاش یہ نکتہ ہمارے نکتہ ور بھی سمجھ سکتے۔

زبان کوئی بھی ہو نہ صرف قابل احترام ہے بلکہ زبانوں کا تنوّع اور رنگارنگی خالق کائنات کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ محض تعصب اور بے نام خوف کی وجہ سے کسی زبان کے علوم سے فائدہ نہ اٹھانا سخت بے واقوفی ہے، عرض کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اپنی روایات، اقدار اور ثقافت سے محبت کی جائے، اردو میں مطالعے کی عادت ڈالی جائے اور اس میں پائے جانے والی اجنبیت اور دوری کو دور کیا جائے۔

پاکستان کے کئی تعلیمی بورڈ وقفے وقفے سے انگلش میڈیم طرز تدریس کو اختیا کرنے کا اعلان کر چکے ہیں۔ اس ضمن میں برطانوی ادارہ برٹش کونسل کی ایک رپورٹ ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ اس ادارے نے حال ہی میں 'ٹیچنگ اینڈ لرننگ ان پاکستان' کے نام سے یہ رپورٹ شائع کی ہے جس میں پاکستانی تعلیمی ماہرین اور ارباب اختیار کو مشورہ دیا گیا کہ بنیادی تعلیم 'مادری زبان' میں ثانوی تعلیم 'قومی زبان' میں اور اعلیٰ 'تعلیم بین الاقوامی' زبان میں ہونی چاہیے۔۔۔۔۔۔ ہماری رائے میں اعلیٰ کا انگریزی میں حصول عبوری دور کے لیے بلکل درست بلکہ ناگزیر ہے مگر ساتھ ساتھ جدید سائنسی اصلاحات کو اردو میں ڈھالنے اور اختیار کرنے کا عمل جاری رہنا چاہیے تاکہ پیچیدہ سائنسی مسائل کو عام فہم انداز میں پیش کیا جا سکے۔

اردو دوسری زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر سمو لینے کی خداداد صلاحیت رکھتی ہے جسکی وجہ سے اردو لغت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے مگر اردو الفاظ کے موجود ہوتے ہوئے فقرات میں انگریزی پیوند نکاری کا ایک ایسا خطرناک عمل جاری ہے جسکی وجہ سے کئی اردو الفاظ اجنبی اور متروک ہو کر رہ گئے ہیں۔ جہاں انگریزی ضروری ہو انگریزی الفاظ ضرور ملایئے مگر اس طرح کہ اردو لغت 'امیر' ہو نہ کہ پہلے سے موجود الفاظ سے محروم ہو کر انگریزی کی دست نگر بن جائے۔

اردو میں 'ٹو دی پوائنٹ' بات نہ ہو سکے جسے اشکالات کو چند روز کا مطالعہ رفع کر دیتا ہے کیونکہ اگر اردو میں لکھیں اور پڑھیں گے نہیں تو بولتے ہوئے 'ایزی فیل' کیسے کر سکیں گے؟؟

ہمیں بحیثیت قوم خود کو اپنی عزت کا احساس دلانا چاہیے اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے شعائر، اجتماعی عادات، سماجی رویوں، ادبی سرمائے اور تاریخ میں سے خوبصورت پہلو تلاش کریں اور ان کو چمکا کے سامنے پیش کریں کیونکہ نفس اور خودداری فرد کی طرح اقوام کی ترقی کیلئے بھی پہلا زینہ ہے۔

کفایت شعاری ایک قومی دولت ہے۔ (قائداعظم محمد علی جناح)

اسماء
11-TE-124

مجھے شکایت ہے

مجھے شکایت ہے۔۔۔۔۔۔ مجھے شکایت ہے آج کے دوَر سے۔۔۔۔۔۔ مجھے شکایت ہے آج کی اس حکومت سے۔۔۔۔۔۔ مجھے شکایت ہے۔۔۔۔۔ یہاں کے لوگوں سے۔۔۔۔۔ مجھے شکایت ہے اپنے وطن کے رہنماؤں سے۔۔۔۔۔ مجھے شکایت ہے اس ملک کے ہر شہری سے۔۔۔۔۔۔ مجھے شکایت ہے۔۔۔۔۔ یہاں کی آزاد عدلیہ سے اور میڈیا سے اور اس سائنسی ترقی کرتے ہوئے ملک وقوم سے۔۔۔۔ آخر کیوں؟؟

وہ اس ملک کو تباہی کی طرف لے کر جا رہے ہیں۔ کیونکہ وہ اس ملک کا امن وسکون برباد کر رہے ہیں۔ کیونکہ وہ اسلام کے نام پر حاصل کیے گئے اس ملک کو دہشت گردی کا نشانہ بنا رہے ہیں۔ جس کو ہمارے مذہب نے جائز ہی نہیں قرار دیا۔

مجھے شکایت کیوں ہے؟ مجھے شکایت اسلئے ہے کہ اپنے وطن کو تباہ و برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتی کیونکہ مجھے اپنے وطن سے بہت پیار ہے۔ ہماری حکومت جس میں آ کر کوئی اس ملک کے غریب شہریوں کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔ پہلے آتے ہیں صدارت سنبھال کر بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں لیکن چند دنوں بعد ہی اپنے اصلی رنگ دکھانا شروع کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہمارے لئے نہیں اپنے لئے آتے ہیں۔ اپنے مفاد کے لئے وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ انہی کے چند فیصلوں کی وجہ سے عوام میں انتشار پیدا ہوتا ہے اور وہ سڑکوں پر آ جاتے ہیں اور خوب تباہی و بربادی کرتے ہیں۔

مجھے شکایت ان شہریوں سے بھی ہے کہ وہ حکومت کی وجہ سے اپنا ہی نقصان کیوں کرتے ہیں۔ اپنے گھروں کو کیوں جلاتے ہیں۔ کیوں اپنی ہی جانیں ضائع کرتے ہیں جب کہ ان پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے شکایت اپنی حکومت سے اس لئے بھی ہے کہ ہمارا ملک جو زرعی پیداوار کا حامل ہے جو کہ زرعی اجنا برآمد کرتا ہے۔ آج وہی اپنے ملک میں آٹے کا بحران برداشت کر رہا ہے۔ عوام بھوک سے مر رہی ہے۔ اتنی غربت ہے کہ لوگوں کو ایک وقت کی روٹی بھی میسر نہیں آتی۔

آٹے سے دھیان ہٹایا جائے تو فوراً لوڈ شیڈنگ ذہن میں آتی ہے کہ جب دیکھو لوڈ شیڈنگ۔ دن میں چھ سے آٹھ گھنٹے بجلی جانے کے باوجود ہمارے ماہانہ بل میں کوئی کمی نہیں آتی آخر کیوں؟؟

مجھے اپنی حکومت سے شکایت اس لئے بھی ہے کہ اپنے بچوں کو تو وہ بیرونِ ملک تعلیم دلاتے ہیں مگر ہمارے ملک کے بچے اپنے ملک میں ہی تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ تعلیمی فنڈز کہاں جاتے ہیں۔ کوئی بتائے تو سہی۔

کسی کے ایمان کا اندازہ اس کے وعدوں سے لگاؤ۔ (حضرت علیؓ)

مجھے شکایت اس لئے بھی ہے کہ وہ اپنے ملک وقوم کے شہریوں میں کیوں جذبہ حب الوطنی پیدا نہیں کرتے۔اگر ہمارے لیڈروں کے جلسوں میں جاؤ تو وہاں سے دھماکے کی خبر سنائی دیتی ہے۔کبھی وہ خود اس طبقے کے لوگوں سے جا کر ملیں جو ایک وقت کا کھانا بھی نہیں کھا سکتے۔مجھے شکایت ہے اپنے محلے داروں سے، دوستوں اور رشتہ داروں سے، کیوں وہ ایک دوسرے کے درمیان نفرتیں پیدا کرتے ہیں؟ کیوں وہ ایک دوسرے کو بدگمان کرتے ہیں؟ کیوں وہ اپنے ملک کو صاف نہیں رکھتے ہیں؟؟ کیا یہ ہماری دھرتی نہیں؟؟ کیوں ہم اس کی حفاظت نہیں کرتے؟؟

خدا کرے کہ میری ارضِ پاک پر اُترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشہ زوال نہ ہو

کیونکہ ہمارا ملک بہت زرخیز ہے اور بہت سی صلاحتیں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور اس ملک کو صحیح راہنمائی کی ضرورت ہے اس مقصد کو پانے میں خدا ہمارا حامی وناصر ہو۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اے کاش ہمارا ملک بھی صحیح معنوں میں امن کا گہوارا امن جائے اور ہمیں پاکستانی کہلانے پر فخر ہو۔۔۔(آمین)

کچھ مزاحیہ!

بیوی: تم سوتے ہوئے مجھے گالیاں دے رہے تھے۔
شوہر: تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔
بیوی: کیا غلط فہمی ہوئی ہے؟
شوہر: یہی کے میں سو رہا تھا۔

ہر راحت کے بعد الم اور ہر الم کے بعد راحت ہے۔(سقراط)

حلیمہ سعدیہ
11-TE-115

ہمارا نظام تعلیم۔ترقی یا بگاڑ

کسی ملک کی ترقی کا انحصار سب سے پہلے تعلیم پر ہے۔کیونکہ تعلیم ہی وہ شعور کی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر کوئی قوم اپنی منزل پا سکتی ہے۔یورپ نے تعلیم کو اپنی کامیابی کا ذریعہ بنایا تو ہماری اندھا دھند تقلید کرنے والی قوم نے اس کا خاصہ گہرا اثر قبول کیا۔تعلیم ،شاید ہماری قوم اس لفظ کے معنی اور مفہوم سے بہت دور کسی اور چیز کی کھوج میں نکل پڑی ہے۔کیونکہ اگر ہم تعلیم پر زور دینے والے ہوتے تو ہمارا مذہب ہی ''اقراء'' سے شروع ہوا۔لیکن ہم نے کبھی اس ''اقراء'' پر غور کرنے کی ضرورت محسوس ہی نہیں کی۔بلکہ جب ہم نے دیکھا کہ انگریزوں نے تعلیم کی بدولت ترقی کی ہے تو ہم نے ان کی روش اختیار کرنے کی کوشش شروع کر دی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری شرح خواندگی کا گراف بلند ہونے لگا۔لیکن ہمارے معاشرتی بگاڑ کا گراف اس سے زیادہ تیزی سے بڑھا اور یہ مسلسل بڑھتا جا رہا ہے۔ہمارے آج کے نظام تعلیم سے کیا ہوا صرف یہی کہ ہمارے ملک میں بہت سارے لوگ ڈاکٹر اور انجینئر بن گئے۔لیکن صد افسوس کہ لوگ انسان بننے سے محروم ہونے لگے ہیں۔آج ہماری دھرتی پر وہ کونسا فساد ہے جو برپا نہیں ہو رہا۔تعمیر کی بجائے ہر جگہ تخریب نظر آتی ہے۔آج ہماری قوم کا ہر فرد احساسات سے عاری نظر آتا ہے۔ہر کسی کو پیسے سے غرض ہے۔

آج کا دور الیکٹرانک میڈیا کا دور ہے۔ذرائع ابلاغ اخلاقی انحطاط کا باعث بن رہے ہیں۔یہاں والدین انتہائی مصروف ہیں تو اساتذہ ان سے بھی زیادہ خود کو مصروف ظاہر کرتے ہیں۔تو پھر قوم کے معماروں کو ہم انگریزی ادب ہاتھ میں دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ترقی کر لیں گے۔ہمارے فساد کی ابتدا وہاں سے ہوئی جہاں سے ہم نے اپنے مذہب کو اپنے علم وفنون سے الگ کر دیا۔ہم نے ایک طرف اپنے تعلیمی اداروں میں صرف اسلامیات کے نام سے چند صفحات شامل کر کے خود کو بری الذمہ ثابت کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف دینی تعلیم حاصل کرنے والوں کو ملاّ سسٹم کے حوالے کر دیا۔حالانکہ یہ بات قدرت کے اصول کے خلاف ہے۔کیونکہ جب تک انسان کو اچھائی کی ترغیب اور برائی کے انجام سے نہ ڈرایا جائے وہ غلطی سے باز نہیں آ سکتا۔چنانچہ ہمارے آج کے نظام تعلیم نے ہمیں سوائے گوناں گوں مسائل میں الجھانے کے اور کچھ نہ دیا۔ہماری آج کی یونیورسٹی کا طالبعلم اس لہجے میں بات کرتا ہے کہ اسے سن کر کوئی جاہل بھی شرم سے پانی پانی ہو جائے۔اخلاقیات کے تمام درس پسِ پشت ڈال دیے گئے ہیں۔تو پھر کیا فائدہ ایسی تعلیم کا جو آپ کو فزکس اور کیمسٹری کے سارے laws تو سکھا دے لیکن انسانیت کا کوئی law نہ سکھا سکے۔یہ وقت اس بات کو سوچنے اور اسے حل کرنے کا ہے۔ہمیں اس نظام تعلیم کو ان اصولوں پر رائج کرنا ہوگا جس کا حکم ہمیں ہمارے مذہب نے دیا۔کیونکہ انہی اصولوں کی بدولت جابر بن حیان، البیرونی محمود غزنوی اور ٹیپو سلطان جیسے نام پیدا ہوئے۔ہمارا نظام تعلیم دینوی اور دنیاوی تعلیم کا ایسا امتزاج ہونا چاہیے جو نہ صرف طالبعلموں کی علمی پیاس بجھائے بلکہ ان کی بہترین تربیت بھی کرے۔ایک اچھے، یکساں اور متوازن نظام کی بدولت ہی آج کا طالبعلم خلوصِ دل سے اپنے مقصد کو پانے کی راہ پر چل سکتا ہے۔یہ آج کے نوجوان ہی ہمارا مستقبل ہیں انہی کو کل ملک کی باگ دوڑ سنبھالنی ہے سو ان کی بہترین تربیت کرنا ہمارا فرض ہے۔

راہ وہ پکڑ جو بندے کو خالق سے ملا دیتی ہے۔(وارث شاہ)

ام ہانی
11-SE-21

جعلی ادویات، سستی موت

"مَنْ غَش فَلِیْسَ مَنی"

جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں۔

تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ جب خداوند باری تعالیٰ نے مٹی سے بنے ہوئے اس پتلے میں روح پھونکی تو ایک ایسا مثالی پیکر وجود میں آیا جسے دیکھ کر فرشتوں پر حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور حکم خداوندی پر فوراً اس کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔

فرشتہ مجھ کو کہنے سے میری تحقیر ہوتی ہے
میں مسجودِ ملائک ہوں مجھے انسان رہنے دو

اس میں کوئی شک نہیں کہ خوبصورت سانچے میں ڈھلا رنگ ورعنائی کا یہ مجسمہ اللہ رب العزت کی انجینئرنگ کا ایسا نمونہ ہے کہ بڑے سے بڑا سائنسدان بھی حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پھر کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ماہ وسال کی گردش کے ساتھ اس پیکرِ حسنِ کے کسی نظام میں کوئی خرابی ہونے لگتی، جسے بیماری کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مگر جو خالق ہماری کسی غلطی کے سبب یا آزمائش کے لئے ہمیں بیماری کی اذیت سے دوچار کرتا ہے وہیں اس مالک کون ومکاں نے اس کا علاج بھی نازل فرما دیا ہے۔

حدیث نبوی ﷺ ہے:

"مَاْ اَنْزَلَ اللّٰہُ دَاءُ اِلَّا نُزَل لَہُ شَفَاءُ"

اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسی بیماری نازل نہیں کی جس کا علاج نازل نہ کیا ہو۔

بیماری کی اذیت سے چھٹکارا پانے کے لئے علاج شروع ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں، حکیموں کے در شفا پر دستک دی جاتی ہے مگر "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کے مصداق بیمار کی حالت دن بدن بگڑتی چلی جاتی ہے۔ بسترِ علالت پر پڑے جوانی ورعنائی کے مجسمے کی آنکھوں کے دیوں میں زندگی کی لو ٹمٹمانے لگتی ہے۔ وہ درد کا مارا فریاد کرتا ہے

ابن مریم ہوا کرے کوئی
میرے درد کی دوا کرے کوئی

لیکن بہن بھائیوں کی کوشش، والدین کی دعائیں، عزیز واقارب کی بھاگ دوڑ سب بے کار ثابت ہوتا ہے۔ خوبصورت آنکھوں کے دیپ بجھ جاتے ہیں۔ اور امیدوں، امنگوں، خواہشوں اور آرزوؤں سے بھرا ہوا دل ہمیشہ کے لئے ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔

تھے کتنے ستارے کہ سرِ شام ڈوبے

ہم دولت سے نرم بستر حاصل کر سکتے ہیں مگر نیند نہیں۔ (بقراط)

آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا اس لئے کہ شفا دینے والے ہاتھ ہی موت کا جام پلا رہے ہوتے ہیں؟ یا اس لئے کہ صحت کا پیام، حیات بخش دوائیں ہی زہر ہلاہل ثابت ہوتی ہیں؟ صحت یاب ہو کر دوبارہ زندگی کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونا مریض کا مقدر کیوں نہیں ٹھہرتا؟

جبکہ پیارے نبی ﷺ کا فرمان ہے:

''ہر بیماری کا علاج ہے۔ جب علاج بیماری کے مطابق ہو جاتا ہے تو پھر اللہ کے حکم سے تندرستی حاصل ہو جاتی ہے''

یہ سب اس لئے ہوتا ہے کہ یہ ادویات جعلی ہوتی ہیں۔ ان میں آبِ بقا کی بجائے زہر فنا بھرا ہوتا ہے۔ یہ جعلی ادویات کھانسی اور زکام جیسے معمولی امراض سے شروع ہو کر کینسر اور عارضۂ دل جیسے جان لیوا امراض میں مبتلا مریضوں کو دی جا رہی ہیں۔ ڈاکٹر اپنی آمدن میں اضافہ کے لئے مریضوں کو سالہا سال مریض بنائے رکھتے ہیں۔

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل
وہ دوکان اپنی بڑھا گئے

سستی موت بانٹنے کے اس شرمناک کاروبار میں کیمسٹ سے لے کر بڑے بڑے ڈاکٹر اور معمولی عطائی سے لے کر بڑے بڑے سرمایہ دار ملوث ہیں۔ اخبارات میں آئے دن جعلی ادویات بنانے والی فیکٹریوں سے متعلق خبریں اخبارات کی زینت بنتی ہیں۔ چند دن خوب شور وغوغا ہوتا ہے اور پھر ایک گہری خاموشی چھا جاتی ہے۔

ہر پل یہاں بشر کی یوں کٹ رہی ہے کھیتی
ظالم تیرے جہاں کے دہقاں ہوئے ہیں

ایک مشہور حکایت ہے ''نیم حکیم خطرۂ جان'' مریض کو معلوم ہی نہیں ہو پاتا کے یہ زہریلی دوائیں اور موت بھرے انجکشن، اس کے روشن دماغ اور خوبصورت دل والے وجود کو موت کی تاریک وادیوں میں دھکیل رہے ہیں۔ جعلی ادویات کا شکار بننے والے بے گناہ انسان کا بے جان جسم اور بے نور آنکھیں ہم سے سوال کرتی ہیں۔

میں کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

اقوام متحدہ کے انسدادِ منشیات کے عالمی ادارے کی ایک رپورٹ کے مطابق ترقی پذیر ممالک میں 50% سے زائد جعلی ادویات فروخت ہوتی ہیں۔ WHO کے مطابق جعلی ادویات کے حوالے سے پاکستان تیسرے نمبر پر ہے۔ اس کالے دھندے میں دوائی تجویز کرنے والے چند معالج بھی شامل ہیں اور ادویات بنانے والی فارماسوٹیکل کمپنیاں بھی۔ ڈرگ کنٹرول انسپکٹرز بھی اور ان کو پکڑنے اور کیفر کردار تک پہنچانے والے ادارے بھی۔ لیکن جعلی ادویات کا شکار بننے والوں کی روحیں پکار پکار کر کہتی ہیں۔

کبھی تو آئے گا ایسا دن بھی، ہم اپنے خوں کا حساب لیں گے
جو ظلم کرتے ہیں آج ظالم، وہ کل اس کا جواب دیں گے

موت کا یہ کھیل کب سے شروع ہے اور کب تک جاری رہے گا؟ کوئی نہیں جانتا۔ جعلی ادویات بنانے والی یہ فیکٹریں کب تک لوگوں میں سستی موت بانٹتی رہیں گی؟ جعلی ڈاکٹر اور عطائی کب تک مریضوں کی رگوں میں زہر انڈیلتے رہیں گے؟ کب کوئی ہاتھ ان کے گریبانوں تک پہنچ پائے گا!

قلتِ عقل کا اندازہ کثرتِ کلام سے ہوتا ہے۔ (بوعلی سینا)

کب کوئی مسیحا آئے گا؟

ارے کوئی مسیحا ادھر بھی دیکھے
کوئی تو چارہ گری کو اٹھے
افق کا چہرہ لہو سے تر ہے
زمیں جنازہ بنی ہوئی ہے!!!

نہ جانے کتنے لوگ روزانہ جعلی ادویات کا شکار ہو کر اپنا زخموں سے جلتا دل لئے شہر خموشاں میں ہمیشگی کی نیند سو جاتے ہیں۔ کون یہ بتا پائے گا کہ خوبصورت جو انیوں کی بہاروں کو خزاؤں کے حوالے کرنے والے یہ ہاتھ کس کے ہیں؟ نہ جانے ہر روز کتنے معصوم پھول اور ننھی منہ بند کلیاں کھلنے سے پہلے ہی روند دی جاتی ہیں اور کتنے بے قصور اپنا قصور جانے بغیر موت کی تاریک وادیوں میں اتر جاتے ہیں۔

حسرت ان غنچوں پر جو بن کھلے مرجھا گئے

حدیث مبارکہ ہے:

''جس نے ایک نفس کو قتل کیا گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کیا''

کبھی تو کوئی ہاتھ اٹھے گا جو پوری انسانیت کے خون سے ہاتھ رنگنے والوں کے گریبانوں تک پہنچے گا۔ جب تک انسانیت کے ان دشمنوں کو عبرت ناک سزائیں نہیں دی جائیں گی تب تک یہ قومی مجرم اس ملک کے عوام کی صحت سے کھیلتے رہیں گے اور ان کے ہاتھوں ہر سال ہزاروں بے گناہ افراد موت کے منہ میں جاتے رہیں گے۔

انور مسعود نے جعلی ادویات کا شکار بننے والوں کی داستان غم کو بڑے لطیف انداز میں اشعار میں ڈھالا ہے۔

کل یہ بات کہتا تھا اک مریض دوجے سے
ہسپتال میں آ کر بھی میرے بھائی کیا پایا
کس قدر ملاوٹ ہے ادویات میں بھائی
درد کی دوا پائی، دردِ لادوا پایا

صاحبِ امروز وہی ہوتا ہے جو زمانے کے سمندر کا غواص ہو۔ (علامہ اقبال)

مستبشرہ فاروق
10-CP

لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

زندگی یاس و امید کا تصادم ہے۔ناامیدی اور مایوسی کفر ہے۔آج ہم دیکھتے ہیں کہ مایوسی کے اندھیروں نے چہار جانب اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہیں۔ایک گھٹن،خوف، بے یقینی،تذبذب،اندھیرا اور اندیشہ ہے جس کے گرداب میں آج کا انسان پھنس کر رہ گیا ہے۔آج چمنستان مکتب کے گلہائے خوش رنگ مرجھائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔حجر و شجر افسردہ نظر آرہے ہیں۔گویا وہ حلقۂ مکتب جو بہاروں کا نشیمن تھا آج خزاؤں کا مسکن ہے۔

میں نے دیکھی ہے ہر اک پھول کی آنکھ پرنم
کیسے کہدوں کہ گلستان میں بہار آئی ہے

فضاؤں کی افسردگی سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج گلاب کی پتیاں ادھر اُدھر بکھرنے والی ہیں۔مانوس چہرے آنکھوں سے اُوجھل ہونے والے ہیں۔یہ مغموم اور زرد چہرے رنج و غم پر مبنی جذبات و احساسات کی غمازی کر رہے ہیں۔قبائے اُمت لہولہو ہے۔عالم کفر ملت کے اجزاء کو آپس میں تقسیم کر کے صفحۂ ہستی سے مٹانے کے درپے ہے۔ بیروزگاری، کرپشن اور بڑھتی ہوئی مہنگائی نے ہر طرف خوف اور بدحواسی برپا کر دی ہے۔

ملک میں دہشت گردی،فساد، بدامنی،عدم سکون اور جدائی کے کربناک واقعات کے باعث ہمارے ہونٹوں سے ذوق تبسم چھن گیا ہے۔ہمارے قہقہوں کی شوخیاں ماند پڑ گئی ہیں مگر

دل نا امید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

اچھے دنوں کی یہ خرابی ہوتی ہے کہ وہ جلد ختم ہو جاتے ہیں اور برے دنوں کی یہ خرابی ہے کہ وہ گزرنے کا نام ہی نہیں لیتے کم از کم ایسا لگتا ضرور ہے کہ

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا ، یہ وہ سحر تو نہیں

شمع بن جانے کے دعوی سے پروانہ بن جانا زیادہ باعثِ افتخار ہے۔(مولانا رومیؒ)

یہ وہ سحر تو نہیں جسکی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں

فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہو گا شب ست موج کا ساحل

لیکن برے دن گزر جائیں گے اور اچھے دن آ جائیں گے۔ تاریکی خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو، چھٹ ہی جاتی ہے اور اب امتحان کی ایسی مشکل گھڑی میں ہمیں ماضی کی طرف دیکھنا چاہیے۔ پاکستان کے قیام کے وقت مسلمانان ہند مایوس نہیں تھے پر اُمید تھے۔ وقت کٹھن تھا اپنوں کی لاشیں پاس تھیں لیکن اپنے ہدف سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹے کیونکہ اُن کے پاس اُمید کی کرن تھی اور نعرہ تھا 'لے کر رہیں گے پاکستان، بن کر رہے گا پاکستان'۔ ہمیں بعض ایسی قوموں کی طرف دیکھنا چاہیے جنہوں نے ناقابل برداشت سانحے سہے مگر چیخ و پکار نہیں کی۔ ان میں بیسوی صدی کی سب سے بڑی مثال جرمنی اور جاپان کی ہے۔ جرمنی کو اتحادی فوجوں نے اور ہٹلر کی اپنی فوجوں کی نفرتوں اور تعصّبات نے وہ نقصان پہنچایا جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ تمام مصائب کے باوجود جرمن اپنی آستینیں چڑھا کر اور اپنی کمر کس کر اپنی تعمیر نو میں لگ گئے۔

قارئین، یہ جو وقت ہم پر آن پڑا ہے، ایسے وقت قوموں پر اپنی ہی کی ہوئی غلطیوں کی وجہ سے آتے ہیں۔ لیکن بہترین حکمت عملی ہی ایسے وقت میں قوموں کو بحران سے نکال کر ایک بہتر پہچان دیتا ہے کیونکہ ایسے سنگین حالات کی بھٹی میں پک کر کندن بننا ہی زندہ قوموں کی نشانی ہے۔ لہذا ہمیں بھی مایوس نہیں ہونا۔ آج ملک وقوم کی بقا کے لئے عمل کوشش کی ضرورت ہے۔ اگر ہم تن آسان بنے رہے تو راستے تاریک اور منزل دور ہو جائے گی۔ اگر ہم نے سعی و کوشش کو اپنا شعار بنائے رکھا تو ہمارا حال ایک تابناک مستقبل کا آئینہ دار بن جائے گا۔ آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ہراول دستے کے طور پر غلبہ حق کی بحالی کے لئے کوشاں رہیں اسلئے کہ یہی وقت کا تقاضا ہے۔ اگر یہ ہمت ہم میں پیدا ہوگئی تو پھر مایوسیوں کو کہیں پناہ نہیں ملے گی۔

کچھ مزاحیہ!

غم سے روح میں توانائی آتی ہے۔ (حضرت حسن بصریؒ)

پاکستانی سیاست میں خواتین کا کردار

سیدہ تحریم زہرہ
11-EE-110

کہا جاتا ہے کے آج کے دور میں خواتین ہر شعبہء زندگی میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کر رہی ہیں۔ بلکہ بعض شعبوں میں تو مردوں سے بڑھ کر کام کر رہی ہیں۔لیکن دیکھا جائے تو موجودہ دور میں ہی نہیں بلکہ ماضی میں بھی خواتین نے مردوں کے شانہ بشانہ کام کیا۔ بلکہ پاکستانی سیاست کو دیکھا جائے تو ہمیشہ سے ایسی خواتین سیاسی میدان میں موجود رہی ہیں جنہوں نے ملک وقوم کا سر فخر سے بلند کیا اور سیاسی میدان میں ایسا کام کیا کہ لوگ آج تک انکی مثالیں دیا کرتے ہیں۔تحریک پاکستان میں مادر ملت محترمہ فاطمہ جناح اور بیگم رانا لیاقت علی خان کا کردار نا قابل فراموش ہے۔ مادر ملت کا کردار ایک مونس وغمگسار بہن کا اور بیگم رانا لیاقت علی خان کا کردار قائد ملت لیاقت علی خان کی انتہائی با اعتماد رفیقہء حیات کا تھا۔اور اسی طرح تحریک پاکستان کے بعد بیگم جہاں آراء شاہنواز اور بیگم شائستہ اکرام اللہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی میں سرگرم عمل رہیں۔

بعد میں آنے والی پاکستانی سیاست کو دیکھا جائے تو نظر آتا ہے کہ خواتین پاکستانی سیاست کے ہر دور میں سرگرم عمل رہی ہیں اور ملک کے تقریباً تمام سیاسی معاملات میں خواتین کا کردار نظر آتا ہے۔ ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء کے نفاذ کے بعد بیگم نصرت بھٹو پیپلز پارٹی کی قائم مقام چیئر پرسن بنیں۔اس سے پہلے ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں بھی بیشتر خواتین اسمبلی کی رکن منتخب ہوتی رہی ہیں اور قومی سیاست میں اپنا کردار ادا کرتی رہی ہیں مثلاً بیگم زہرہ عزیزہ بیگم یسین۔ بالکل اسی طرح جھنگ کی بیگم عابدہ حسین کو اسی دور میں پنجاب اسمبلی کی خواتین کی نشست پر رکن اسمبلی بنایا گیا۔

آگے آنے والے دور کو دیکھا جائے تو بیگم نصرت بھٹو نے ۱۹۸۸ء میں بیک وقت قومی اسمبلی کے دو حلقوں سے کامیابی حاصل کی تھی۔۱۹۷۷ء سے ۱۹۸۸ء کا درمیانی دور جیسا کہ دیگر شعبۂ زندگی میں خواتین کے زوال کا دور تھا اسی طرح قومی سیاست میں بھی خواتین کا حصہ نہ ہونے کے برابر تھا۔لیکن آنے والے دور میں ملک بھر سے خواتین ایک سیاسی طاقت بن کر ابھریں جس کی واضح مثال یہ ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو قومی اسمبلی کے ۳ حلقوں سے بیک وقت کامیاب ہوئیں اور پاکستان کی پہلی خاتون وزیر اعظم منتخب ہوئیں۔اسکے علاوہ بھی بہت سی خواتین کا کردار قابل ذکر ہے۔جیسے کہ بیگم عابدہ حسین ۱۹۸۸ء کے الیکشن میں براہ راست دو حلقوں سے منتخب ہوئیں اور بعد میں وہ امریکہ میں پاکستان کی سفیر بھی رہیں۔ان کے علاوہ ایک خاتون ایڈیٹر ڈاکٹر ملیحہ لودھی اور قومی اسمبلی کی ایک سابقہ رکن مس شیریں رحمان بھی مریکہ میں پاکستان کی سفیر نامزد ہوئیں۔شیریں رحمان وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی کی کابینہ میں پہلی خاتون وزیر اطلاعات بھی رہیں۔اسی طرح قومی اسمبلی کی اسپیکر منتخب ہونے والی ڈاکٹر فہمیدہ مرزا بھی ۲۰۰۲ء اور ۲۰۰۸ء میں رکن اسمبلی منتخب ہوئیں او ۲۰۰۸ء میں انہیں اسپیکر کا درجہ دیا گیا۔اسکے علاوہ ذوالفقار علی بھٹو کی بہو غنوہ بھٹو بھی پاکستان پیپلز پارٹی غنوہ بھٹو گروپ کی چیئر پرسن ہیں۔اور میر مرتضیٰ بھٹو کی بیٹی فاطمہ بھٹو کا شمار بھی انتہائی باکمال اور دانشور خواتین میں ہوتا ہے۔چنانچہ یہ خواتین کسی وقت بھی ملکی سیاست میں ابھر کر آنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

ان چند خواتین کے علاوہ بھی بہت سی خواتین ہیں جو ملکی سیاست میں پس پردہ رہ کر دار ادا کرتی رہی ہیں جن کے نام تو آج کوئی نہیں جانتا لیکن کوئی نہ کوئی تاریخی واقع ان سے منسلک ہے اور ان کے بغیر تاریخ ضرور نامکمل ہوگی۔تاریخ لکھنے والے جب پاکستان کی سیاسی تاریخ لکھنے بیٹھیں گے تو ہر واقعے میں انہیں کسی نہ کسی خاتون کا بالواسطہ یا بلاواسطہ کردار ضرور نظر آئے گا اور وہ پاکستانی خواتین کی اہلیت کے قائل ہوئے بنا نہ رہ سکیں گے۔

محبت ازلی وابدی ہے۔(حضرت رابعہ بصریؒ)

ڈاکٹر صباحت قدوس
میڈیکل آفیسر یو ای ٹی ٹیکسلا

غذا اور غذائیت

غذا انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ دنیا کے ہر خطے پر اس کے جغرافیائی حالات اور آب و ہوا کے مطابق غذا پیدا ہوتی ہے اور استعمال کی جاتی ہے۔ ہمارا پاکستان بھی غذائی دولت سے مالا مال ہے۔ یہاں اجناس، پھل، سبزیاں، مچھلی، گوشت، انڈے، دودھ سبھی کچھ پایا جاتا ہے۔ اور حسبِ استطاعت استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ مگر کیا وجہ ہے کہ یہاں خون کی کمی (Anemia)، ہڈیوں کی بیماریاں، اور جسمانی کمزوری عام ہے اور ہر دوسرا خون کی کمی اور جسمانی عوارض کا شکار نظر آتا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ غذائیت سے کم علمی اور کسی بھی غذا کا حد سے زیادہ استعمال ہے۔ اس کم علمی بلکہ لاعلمی کی وجہ سے ہم بہت سی غذائیں استعمال تو کر لیتے ہیں مگر وہ کسی وجہ سے ہمارے جسم کا حصہ نہیں بن سکتیں۔ خون کی کمی (Anemia) ہمارے ہاں ایک عام بیماری ہے۔ جب کہ روزمرّہ کی غذا میں موجود آئرن سے پوری ہو سکتی ہے مگر ہماری عادت ہے کہ غذا کی غلط اشتراک کا استعمال کرتے ہیں۔ انڈے کو ہی لیجیے انڈے کی زردی میں وافر مقدار میں آئرن پائی جاتی ہے جو کے سارے دن کی فولاد کی ضرورت کے لیے کافی ہے۔ مگر ہم صبح ناشتے میں دودھ یا دودھ والی چائے پی لیتے ہیں اب دودھ میں وافر کیلشیم ہے جو انڈے کی آئرن کے ساتھ مل کر ایک غیر حل پذیر شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور سرے سے خون میں شامل ہی نہیں ہوتی۔ دوسرا چائے میں کیفین ہوتی ہے جو کہ آئرن کو ضز و بدن بننے سے روکتی ہے۔ انڈا پراٹھا بھی ہمارا ناشتا ہوتا ہے اور پراٹھے میں وافر چکنائی ہوتی ہے اور بات بھر وہی ہے کی چکنائی کی موجودگی آئرن کی افادیت کو کم کر دیتی ہے۔ اگر ہم انڈا کھا کر آدھے لیموں کا رس یا ایسا مشروب جس میں وٹامن سی ہو استعمال کر لیں تو انڈے کی ۱۰۰ فیصد آئرن خون میں شامل ہے جائے گی کیونکہ آئرن کو خون میں شامل ہینے کے لیے وٹامن سی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ تصور بھی عام ہے کہ دوائیاں گرم ہوتی ہیں لہذا جب کسی خون کے مریض کو آئرن کی گولیاں تجویز کی جاتی ہیں تو وہ گھر جا کر انہیں دودھ کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ اور دوا دودھ کے ساتھ کھانے سے دودھ میں موجود کیلشیم دوا میں موجود آئرن کے ساتھ مل کر ایک غیر حل پذیر شکل اختیار کر لیتی ہے جو کہ خون میں شامل نہیں ہو سکتی۔

اب لیجیے کھانا، پلاؤ، بریانی یعنی گوشت بمعہ چاول۔ گوشت میں اچھی خاصی مقدار میں آئرن موجودہ ہوتا ہے اور چاول میں کیلشیم اور نتیجہ وہی ائرن اور کیلشیم کا اشتراک اور جسم میں فولاد کی کمی۔ سبزیاں اور ساگ وٹامن سے مالا مال ہوتے ہیں اور ہمارے ہاں خوش قسمتی سے ملک کے ہر حصے میں سبزی کاشت کی جاتی ہے۔ اور ہماری غذا کا حصہ بھی بنتی ہے۔ مگر ہمارا سبزی کو پکانے کا انداز کچھ ایسا ہے کہ یہ وٹامن ہمارے جسم میں جانے سے پہلے ہی ضائع ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں سبزی کو گھی یا تیل میں بھونا جاتا ہے۔ ساگ کا پانی سکھا کر اوپر سے چکنائی کا تڑکا لگایا جاتا ہے اور اتنی حرارت ملنے سے ساگ میں موجود وٹامن تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اور چکنائی کی موجودگی سبزیوں میں موجود وٹامن کو بھی ضائع کر دیتی ہے۔ اس کے بجائے اگر ہم سبزی کو ہلکا ابھال کر یا بھاپ میں پکا کر استعمال کریں تو ان کی غذائیت کا بھرپور استفادہ کر سکتے ہیں۔ اپنی روایتی اور قدرتی غذا کو چھوڑ دینا بھی آج کل خرابیٔ صحت کی ایک بڑی وجہ ہے۔ پہلے زمانے میں ہمارا مشروب لسّی اور ستو ہوا کرتا تھا اور مہمانوں کی خاطر تواضع بھی اسی سے کی جاتی تھی۔ لسّی کیلشیم سے بھرپور ہوتی ہے۔ اور چکنائی سے پاک ایک بہترین غذا ہے۔ ستو گندم یا جو کے چھلکے سے بنایا جاتا ہے جس میں فائبر ہوتا ہے جو کہ صحت کی لیے بہت اچھا ہے۔ مگر آج ان مشروبات کی جگہ کوک اور پیپسی نے لے لی ہے جو کہ کیفین اور شکر سے بھرپور ہوتی ہے۔ اور متعدد بیماریوں کی وجہ بھی۔ ہمارے ہاں یخنی بھی کمزور اور مریضوں کے لیے تجویز کی جاتی ہے۔ اور عموماً گوشت یا مرغی کو ابال کر بنائی جاتی ہے۔ اور عام تاثر ہے کہ یہ قوت بخش ہوتی ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میں صرف گوشت کا ذائقہ آ جاتا ہے اور گوشت میں موجود پروٹین جو کہ گوشت کی اصل طاقت ہے وہ گوشت ہی میں رہ جاتی ہے اب مریض کو ذائقہ اور چکنائی دار پانی ملتا ہے اور لواحقین گوشت کو پروٹین سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں مچھلی کی بے شمار اقسام ہیں مچھلی سمندر کی ہو یا دریائی، ڈیم کی ہو یا فارمی اسکا گوشت پروٹین سے بھرپور اور چکنائی سے مبرّا ہوتا ہے مگر ہم کھانے سے پہلے مچھلی کو گھی یا تیل میں فرائی کرتے ہیں یعنی اس میں چکنائی کو شامل کر دیتے ہیں جس کہ وجہ سے چکنائی کا مضرِ صحت عنصر شامل ہو جاتا ہے۔ اب ایک مفید چیز میں غیر مفید چیز شامل کر دینا کہاں کی عقلمندی ہے پوری دنیا میں مچھلی کو گرل کر کے یا بھاپ میں پکا کے کھایا جاتا ہے۔ اگر ہم بھی اس طریقے پر عمل کریں تو مچھلی میں موجود غذائیت سے بھرپور فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی طرح دیگر اشیاء میں بھی احتیاط کی ضرورت ہے تا کہ ہم ان کی غذائیت سے بھرپور فائدہ حاصل کر سکیں۔

گر جھکا تو غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من۔ (علامہ اقبال)

توقیر خالد لاریبؔ
09-ME

حلقہء تخلیقِ ادب ٹیکسلا

حلقہء تخلیقِ ادب ٹیکسلا کا نام پاکستان کے نامور ادبی حلقوں میں شمار ہوتا ہے۔اس حلقے نے پاکستان کے نامور شعراء کو جنم دیا جن میں محمد یعقوب آسیؔ، رانا سعید دوشیؔ، راکب راجہؔ، نوشیروان عادلؔ، محمد حفیظ اللہ بادلؔ، طارق بصیرؔ، شہزاد عادلؔ، ظفری پاشاؔ، وحید ناشادؔ، فیصل ساغرؔ، دلاور علی آزرؔ، شکیل شاکی اور توقیر لاریبؔ شامل ہیں۔

حلقہء تخلیقِ ادب ادبی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتا ہے۔

اس حلقے کے تعاون سے انجینئرنگ یونیورسٹی ٹیکسلا میں ایک بھرپور محفلِ مشاعرہ منعقد کروایا گیا جس میں اس حلقے کے شعراء کرام نے بالخصوص اور واہ کینٹ اور حسن ابدال کے شعراء کرام نے بالعموم شرکت کی۔اس کی صدارت محمد حفیظ اللہ بادلؔ نے کی جبکہ نظامت کے فرائض توقیر لاریبؔ نے ادا کیے۔ان میں سے کچھ شعراء کا نمونہء کلام درج ذیل ہے۔

اشارۂ فنائے گُل ہی سمجھیے
ہوا میں خوشبو کا ذائقہ ہونا
ہے کس دورِ بغاوت میں جنم میرا
میں نے دیکھا ہے بندوں کا خدا ہونا

توقیر خالد لاریبؔ

جی چاہتا تھا مر رہوں منظر کمال تھا
اس گل بدن کے ہاتھ میں خنجر کمال تھا
اک سانس کی کمی تھی فقط اور کچھ نہیں
کوزہ گری کمال تھی پیکر کمال تھا
شاکی بجھا کے دیپ ہوا خود بھی رو پڑی
بجھتے ہوئے چراغ کا منظر کمال تھا

شکیل شاکیؔ

صبر اختیار کر کیونکہ دنیا تمام آفات و مصائب کا مجموعہ ہے۔(حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ)

نیند میں کھلتے ہوئے خواب کی عریانی پر
میں نے بوسہ دیا ماہتاب کی پیشانی پر

اس قبیلے میں کوئی عشق سے واقف ہی نہیں
لوگ ہنستے ہیں میری چاک گریبانی پر

دلاور علی آزرؔ

روز جاتے ہوئے اک اینٹ گرا جاتے ہیں
چند لوگوں سے میرا گھر نہیں دیکھا جاتا

اندر کے حالات بدلتے جاتے ہیں
رہ کر تیرے ساتھ بدلتے جاتے ہیں

نوشیروان عادلؔ

جب تلک شہر کے حالات سنوارے جائیں
عین ممکن ہے کہ ہم لوگ بھی مارے جائیں

ہمارے قافلے میں منچلے نا ڈالیے گا
کہ اپنا بوجھ ہمارے گلے نا ڈالیے گا

فیصل ساغرؔ

میں نے بچپن سے بڑھاپے میں قدم رکھا ہے
میں نے دیکھی ہی نہیں اپنی جوانی صاحب

میں اور آئینہ آپس میں لڑ پڑے دونوں
مفاہمت کو کوئی تیسرا نہیں آیا

محمد حفیظ اللہ بادلؔ

ایک محبت سو افسانے

افسانہ - کہانی

وقاص رندھاوا
10-SE

''لذت آمیز درد''

میں ایک چھوٹے سے شہر کا باسی ہوں۔ میرے گھر کے ساتھ ہی گودام کے عقب میں ایک پرانی رہائش گاہ ہے جو کسی دور میں بہاولپور کے نواب خاندان کی حویلی ہوا کرتی تھی۔ آج کل اس عمارت میں چند لوگوں کی تنہائیوں کا طوطی بولتا ہے۔ ان دنوں اس حویلی میں ہر نسل و مذہب کے ضعیف افراد اپنی زندگی کی چند بچی ہوئی ساعتیں اپنے ہی انداز سے چند مشغلوں کے ساتھ صرف کر رہے ہیں۔ کسی بھی ترقی یافتہ یا معمولی شہر میں ایسی جگہ ڈھونڈنا گویا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ میں ایک دو بار وہاں گیا ہوں۔ یہاں پر ایک افسانوی سی فضا ہر وقت چھائی رہتی ہے۔ ایک دن وہاں جانا ہوا۔ حویلی کے آخری سرے کی بنچ پر چند معمر افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ہوا میں کسی قدر خنکی سی تھی۔ شاید نزدیک ہی کہیں بوندا باندی ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ خنکی کے ساتھ ساتھ ہوا میں مٹی کی سوندھی سی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ یا شاید حویلی کے دیرپا ہونے کی وجہ سے یہ خوشبو مستقل طور پر اس سے منسوب تھی۔ اس حویلی میں بہت سے درخت ہیں۔ ان درختوں کے پتے سوکھ کر گرتے ہوئے حویلی کے فرش پر رقص کناں تھے اور سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے۔ جہاں یہ رقص پر کیف اور ایک سرور کی کیفیت کی پیدا کر رہا تھا وہیں حویلی کے سبزہ زار میں کھلے پھول اپنی خوشبو سے سانسوں کو معطر اور ذہن کو قیامت کا سا احساس اور مستی کا سا نشہ دے رہے تھے۔

میں جب وہاں پہنچا تھا تو سب خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد سب مغموم ہو گئے۔ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ اس حویلی کی فضا بہت سحر انگیز اور افسانوی تھی۔ شام ہونے کو تھی سب مضطرب ہو گئے، اٹھے اور ایک درخت کی طرف چلنا شروع ہو گئے۔ اس درخت کے عقب میں بہت بڑا چبوترا تھا۔ میں بھی ساتھ چل رہا تھا۔ اس چبوترے پر ان میں سے ایک بوڑھا چڑھ گیا اور بولنے لگا۔ باقی سارے (چھ تھے) نیچے کھڑے ہو کر اس کا بیان سننے لگے۔ مجھے یوں لگا کہ اس بیان کی سحر انگیزی بھی اس ماحول سے کم نہیں۔ وہ بولا اس چبوترے پر بیٹھتے ہی نجم السحر کی یاد بہت ستاتی ہے۔ وہ سب کے سب اپنے پوتروں کو یاد کر کے بہت آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے۔ وہ بولا یہاں کی افسانوی کیفیت اور فضاؤں کی چاشنی ہی تو ہمیں زندہ رکھے ہوئے ہے۔ مجھے مخاطب کر کے بولے اے وقت کے شباب! تمہیں پتہ ہے کہ ہم اپنے پوتروں کے گھر آنے پر کس قدر خوش ہوا کرتے تھے۔ جب تک کہانی نہیں سناتے تھے تب تک ہمیں سکون نہیں ملتا تھا۔ ان میں سے ایک بولا میرے بیٹوں نے مجھے موبائل فون دے کر کہا تھا کہ ابا جان! یہ وہ آلہ ہے جس کے ذریعے آپ دور دراز اپنے پوتے پوتیوں سے جب دل چاہے بات کر سکتے ہیں۔ میں ہر وقت فون کے پاس ہی بیٹھا رہتا تھا۔ جب گھنٹی بجتی تھی سب کو خاموش ہونے کا اشارہ کرتا تھا لیکن جب پتہ چلتا تھا کہ اشتہاری کال تھی تو آبدیدہ ہو جاتا تھا۔ اسکے ساتھ ہی اس ضعیف کے آنسو ٹپکنے لگے اور وہ آبدیدہ ہو گیا۔ یہ وقت کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے کہ جس شخص کو اپنے اعزہ و اقارب کو ترستے ترستے جان سے ہاتھ دھونا پڑ جائے اور اس کی اولاد اس تک تب پہنچے جب۔۔۔ خدانخواستہ۔۔ ایک اٹھا اور بولا کہ دو تین ضعیف العمر یہاں موجود ہیں جو بہت خوش نصیب ہیں کہ ان کے نہ پوترے ہیں اور نہ بچے۔ وہ ابھی بول ہی رہا تھا کہ ان میں سے ایک اٹھا اور بولا تم لوگوں کے پاس جو سحر انگیز غم ہے، لذت آمیز درد، سرور بخش جو رنج ہے اور کسک اور جو بے چینی ہے وہ مجھے نصیب نہیں اور مجھے لگتا ہے آپ سب انہی کیفیات سے محبت کرتے ہیں۔ جیسے اس کے پاس ہے ہی کیا! ایک بے کیف انسان! ایک خالی انسان! ایسے انسان کا جینا اور مرنا کوئی وقعت اور معانی نہیں رکھتا!!! وہ بزرگ کچھ زیادہ ہی مغموم ہو گئے۔ وہ ہمیشہ اپنے دوستوں کے ایسے کلمات پر ایسا ہی محسوس کرتے تھے۔ اسی اثنا میں ایک عصا بردار، خوش پوشاک اور کرتے میں

خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے۔ (حضرت عثمانؓ)

ملبوس شخص بیت المعمرین کے اس چبوترے پر آن وارد ہوا۔سب منظّم ہو کر بیٹھ گئے۔ مجھے معلوم ہوا تھا وہ شخص علم و آداب کی باتیں سنا کر ان سب کو مغمور اور آبدیدہ کر دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی بچہ کہانی سنتے سنتے آنکھوں میں خمار لئے نیند کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ان بے سہارا اور معمر افراد کے لیے حویلی میں بہت سے مشغلے موجود تھے مگر وہ سب اسی شام کا انتظار کرتے ہوتے تھے۔وہ مخمور شام، حسین لمحے اور وجدانی ماحول۔۔سب کے سب حتیٰ کہ حویلی کے ملازمین بھی ان کی محفل میں بیٹھا کرتے تھے۔اس حقیقت کا انکار تو نہیں کیا جا سکتا کہ کہانی گفتگو کی وہ صنف ہے جو کسی بھی ذہن کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی ۔ہزاروں سال پرانی کتب چاہے وہ مذہبی ہوں یا آسمانی، کہانیوں کی سحر انگیزیوں سے بھری پڑی ہیں۔ان بوڑھوں کی محفل میں بھی علم و ادب کہانیوں کی صورت میں نظر آتا تھا۔کہانی میں ایک مقناطیس کی سی کیفیت ہوتی ہے۔چند لمحوں میں جب وہ عصا بردار اپنے عصا کو ہوا میں پیچ دیتا ہوا چبوترے پر چڑھ رہا تھا تو سب خاموش ہو گئے تھے۔وہ تمہیدی کلمات بولنے لگا کہ آج پھر ہم سب امید کو سائے تلے جمع ہیں۔وطن، زبان، رنگ، نسل، مذہب کے علاوہ انسان تو انسان ہی ہے نا!!!

اس کی آنکھوں میں امید کی کرن نظر آتی تھی۔ میں بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بولا، انسان نے ہر انسان کے لیے اپنے آپ کو سنوارا ہے۔ ہر دور کے لحاظ سے کہانیاں جنم لیتی رہتی ہیں۔آج میں کچھ خاص سنانا چاہتا ہوں۔اس نے اپنا گلا کھنکار کر صاف کرتے ہوئے اپنے کرتے کا اوپری بٹن کھول دیا۔ایک کے اوپر ایک جمی ہوئی ہتھیلیاں اپنے عصا پر رکھیں اور سحر انگیز آواز میں بولنے لگا۔قدر دانِ داستان! ابھی تک آپ مجھ سے زور آور بکمال کے جمال و عشق کی داستان سنتے آئے ہیں۔میں کچھ ایسا چاہتا ہوں کہ وقت آئے کہ کئی پوترے اور نواسے اپنے دادا اور نانا کے شانوں اور رانوں پر محوِ خواب ہو جائیں۔نئی بات سنانے سے پہلے اس کے گرد و پیش بتاتا چلوں۔۔تو برادران متوجہ و ہمہ گوش اور گوش بر آواز!!ایک بادشاہ کا نامہ بر دربار کے عقبی دروازے پر بندھے گھنگرو بجاتا ہوا بجانبِ شاہراہِ قتل رواں دواں ہے۔ہوا میں خنکی پیدا ہو چلی ہے۔مغرب و جنوب سے آندھی کی ہر آہ و بکا کو لے کر قہر مچاتی ہوئی نکلے گی اور پورے شہر کو نابود کر جائے گی۔پھر ماحول بدلے گا۔موسمِ بہار کی خوشبو اپنی آمد کی اطلاع دے گی۔

دوستو! سنو ہر مصیبت سے قبل خالقِ پیر آسمان وارض شبابی اپنی مخلوق کو اتنی ہی ہمت اور حوصلہ عطا فرماتا ہے۔پھر اسی مقدار سے مصیبت نازل کرتا ہے کہ وہ سہہ پائے۔زمانے کی تیز گامی اور طبقات کی کشمکش حال کو جھنجھوڑتی اور مستقبل کا پتہ دیتی ہے۔ایک گروہ آن وارد ہوتا ہے۔سب کو آناً فاناً مارنے لگتا ہے۔ ہلاکو کہتا ہے کہ ان کو چھوڑ دو ان کی نسل آنے دو پھر ماریں گے۔۔۔وہ چپ کر جاتا ہے۔سب بے چین ہو کر پوچھتے ہیں کہ پھر کیا ہوا۔۔۔مگر وہ کچھ نہیں بولتا۔۔تھوڑی دیر کے بعد بولا۔۔کہانیاں تو کہانیاں ہوتی ہیں۔میں ایک بات کرنا چاہتا ہوں جو اہم ہے۔وہ یہ کہ نسل بڑھ بھی چکی ہو مگر ایسے حالات میں جب تم معمر ہو چکے ہو اور اپنی اولاد کے باوجود بے سہارا ہو جاؤ تو ایسی نسل کو قتل کی ضرورت نہیں۔یہ نسل تو خود ہی اپنا قتل کر چکی ہوتی ہے۔ہلاکو رکا کیوں؟ اس نے اگلی نسل کا انتظار کرنے کا کیوں کہا اس کا جواب میں دے چکا۔آواز آئی کہانی سنائیں پھر کیا ہوا۔۔سب چیخے مگر وہ کچھ نہ بولا۔خاموش رہا۔اتنے میں ایک نوجوان چبوترے کی طرف لپکا مگر اس کے ہاتھ صرف عصا ہی آیا۔۔وہ کہانی گوڈھیر ہو چکا تھا۔

محبت وہ کھیل ہے جس میں عقل ہار جاتی ہے۔(ہٹلر)

کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں

ام ہانی
11-SE-21

ان کے نام جن کے بارے میں فرمایا گیا:
''انہیں مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں مگر تم نہیں جانتے''

زندگی میں پہلی بار اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آگے بڑھنا کیسا ہوتا ہے۔ سفید دستانوں میں جکڑے یخ بستہ ہاتھ کو ہونٹوں سے لگا کر اس نے زندگی کی رمق محسوس کرنا چاہی تھی۔ اس لمحے اسے لگا تھا کہ موت کی اس وادی میں وہ تنہا سفر کر رہا ہے لیکن اپنے سے چند گز پیچھے آتے ساتھی کی آواز نے اس کے اندر زندگی کی نئی لہر پیدا کر دی تھی۔ قدم قدم پہ منہ کھولے کئی فٹ گہرے کریوس موجود تھے جو لمحہ بھر میں انسان کو نگل سکتے تھے، جہاں سے عموماً لاشیں بھی نہیں نکالی جاتیں مگر ان کو ہر صورت آگے جانا تھا۔ آخر کون سا جذبہ ہے جو احساس کو جمنے نہیں دیتا، جو ہمیں پیچھے ہٹنے نہیں دیتا؟ یہ سوچ کر اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ رینگ گئی۔

بچپن سے کچھ انوکھا، کچھ نیا، کچھ الگ کرنے کی دھن اس پر سوار رہتی۔ اسے فوج میں جانے کا کوئی شوق نہیں تھا البتہ کسی فوجی کے بارے میں پڑھ کر وہ تجسس کا شکار ہو جاتا۔ ''پاپا! یہ فوجی کتنے عجیب ہوتے ہیں نا!'' اور باپ اپنے ہونہار بیٹے کے منہ سے ایسی معصومانہ بات سن کر مسکرا دیا۔ وہ اکثر سوچا کرتا کیا فوجیوں کا دل نہیں ہوتا؟ کیسے وہ اپنی ساری زندگی اپنے گھر، ماں باپ، بہن بھائیوں، عزیز دوستوں کے بغیر گزار دیتے ہیں۔ موت کو سامنے پا کر ان کے آخری احساسات کیا ہوتے ہوں گے جن کو اپنے ذہن سے جھٹک کر وہ آگے بڑھتے ہوں اور بانہیں پھیلا کر اپنی طرف بلاتی موت کو لبیک کہتے ہوں گے۔ اس لمحے انہیں اپنا کون کون یاد آتا ہوگا!

اس کا فوج میں کمیشن محض ایک اتفاق تھا لیکن اس پر یہ چھوٹا سا خاندان بہت خوش تھا۔ اسے اپنی پاسنگ آؤٹ کا بہت شدت سے انتظار تھا۔ اور جس دن وہ ارتضٰی عثمان سے کیپٹن ارتضٰی عثمان بنا وہ اس کی زندگی کے حسین ترین لمحات تھے۔ ''آپ بہت گریس فل لگ رہے ہیں بھائی'' آیان نے شوخ لہجے میں کہا۔ دراز قد، کشادہ پیشانی، گہری سیاہ چمکدار آنکھیں، ستواں ناک اور ہلکی گندمی رنگت، وہ خوبرو تو تھا ہی مگر خاکی وردی میں ملبوس وہ ایک باوقار شہزادہ لگ رہا تھا۔ ''بیٹا اب تم جان جاؤ گے کہ فوجی کے دل میں کیا ہوتا ہے'' ڈاکٹر عثمان دورانی نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ اور وہ واقعی جان گیا تھا!

''آخر تم ہی کیوں؟ تمہاری جگہ کسی اور کو نہیں بھیج سکتے وہ سیاچن؟ تم تو بہت خوش ہو گے تمہاری دیرینہ خواہش جو پوری ہو رہی ہے، دوسروں کی تمہیں کیا پرواہ۔'' مومل تو اس کی سیاچن پوسٹنگ کی خبر سن کر ہی دوڑی آئی تھی۔ تمہیں کس بات کا ڈر ہے کہ میں چلا گیا تو واپس نہیں آوں گا، وہ مومل کو چڑاتے ہوئے بولا۔ ''بندے کا منہ اچھا نہ ہو تو بات ہی اچھی کر لیتا ہے۔'' وہ غصے سے بولی تھی اور وہ قہقہہ لگا کر دیر تک ہنستا رہا۔ Life is so unpridictable yar وہ

محبت کرنے والے پر موت حرام ہے۔ (علامہ اقبال)

سنجیدگی سے بولا۔ ''ایسی باتیں مت کیا کرو ارتضٰی'' مومل کی آنکھوں میں پانی چمکنے لگا، حلق سے سسکی سی نکلی اور وہ سر جھٹک کر بھاگ گئی۔

مومل حسن دورانی اس کی چچازاد تھی۔ بچپن کی سنگت نے ان کا تعلق گہری دوستی میں بدل دیا تھا۔ اکلوتی ہونے کی وجہ سے مومل کا زیادہ وقت اپنے تایا کے گھر ہی گزرتا۔ تایا تائی کی لاڈلی اور کزنز کی جان۔ چہرے پر پڑتے گہرے ڈمپلز اور بلا کی معصومیت، وہ تھی ہی اتنی پیاری اور سب سے بڑھ کے اس کی ذہانت اور اخلاق جس نے سب کو اس کا گرویدہ بنا رکھا تھا۔

اس کے سامنے آسمان پر سرخ و سرمئی بادلوں کے درمیان سے ڈھلتے سورج کی نارنجی شعائیں جھانک رہی تھیں۔ وہ بادل یقیناً قراقرم کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ ''خدا کرے یہ ہمیں بائی پاس کر کے گزر جائیں'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔ اپنے خیمے سے باہر پتھر پر بیٹھا وہ جوگرز کے نیچے لگے کریمپز سے برف پر لکیریں بناتے ہوئے اپنے ساتھیوں کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے بچپن سے ہی پہاڑوں کی ایڈکشن تھی۔ اسے ہمالیہ اور قراقرم سے عشق تھا۔ لیکن اس کو گھر والوں کی طرف سے کبھی اجازت نہیں ملی۔ اس کے کوہ پیمائی کے شوق سے چڑ کر مومی نے اس کے بیڈروم میں لکھ کر لگایا تھا ''ڈیئر ارتضٰی راکا پوشی بہت خوبصورت ہے اور جو خوبصورت ہوتے ہیں ان سے زیادہ ظالم بھی کوئی نہیں ہوتا، سو اس کا خیال دل سے نکال دو!''۔ کبھی ارتضٰی عثمان نے پہاڑوں کو قریب سے دیکھنے کی محسوس کرنے کی خواہش کی تھی اور اب سیاچن گلیشئر اس کے سامنے چمک رہا تھا۔ کچھ خواب یوں بھی پورے ہوتے ہیں!

دو دن سے موسم شدید خراب تھا۔ اس کی بہت سی دعاؤں کے باوجود برفباری ہنوز جاری تھی، شاید قراقرم پر دعائیں بھی قبول نہیں ہوتیں۔ اپنے اگلو میں بیٹھا وہ گھر سے آئے خطوط پڑھ کر مسکرا رہا تھا۔ ''ارتضٰی بھائی آپ بس جلدی سے واپس آ جائیں آپ کے لیے ایک سرپرائز ہے'' اس کی چھوٹی بہن نجانے اسے کیا سرپرائز دینا چاہتی تھی۔ ''یار تیرا تو وہاں زیادہ ہی دل لگ گیا ہے، واپس آنے کا نام ہی نہیں لیتا'' یہ اس کا دوست نما بھائی آیان تھا۔ امی نے ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اپنا بہت سا خیال رکھنے کی تلقین کی تھی۔ ''ارتضٰی تم تو ہمیں بھول ہی گئے ہو، تم واپس آؤ پھر پوچھوں گی تمہیں'' یہ مومی کا خط تھا ہمیشہ کی طرح دھمکی آمیز۔ اسے Altitude Sickness ہو رہی تھی۔ بلا ارادہ یونہی وہ اپنی ڈائری اٹھا کر دیکھنے لگا، جو صفحہ کھلا اس پر انا طولی بوکریو کے الفاظ درج تھے جو اس نے چار سال پہلے لکھے تھے :

"Mountains have the power to call us into their realms and there,left forever,are our friends whose great souls were longing for the hieghts.Don't forget the mountaineers who have not returned from the summits."

اسے پانی کی شدید ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے برف پگھلانے کے لیے چولھا جلایا۔ پانچ ماہ کے عرصے میں اسے وہاں کی مشکلات کا اچھی طرح تجربہ ہو گیا تھا۔ وہ بے رنگ و بو مایا جو زمین پر صرف پانی ہوتا ہے، پہاڑوں پر آبِ حیات ہوتا ہے۔ ہزاروں فٹ کی بلندی پر کوئی نہیں جانتا تھا کہ زندگی کے آخری لمحات کیسے گزریں گے۔ مردہ پہاڑ کی مردہ چوٹیاں؛ اور وہاں موجود ہر جوان کی دعا تھی کہ یہ سویا ہوا گلیشیئر جاگ نہ جائے۔ مگر شاید قراقرم پر واقعی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔ بہن بھائی واپسی کے منتظر تھے پر وہ واپس کیسے جا سکتا تھا وہ تو بندوق کی آخری گولی اور خون کے آخری قطرے تک لڑنے کا عہد کر کے فوج میں آیا تھا۔ لیکن وہ اتنی جلدی واپس آ جائے گا یہ تو اس کے پیاروں نے بھی نہیں سوچا تھا!

نفرت دل کا پاگل پن ہے۔ (بائرن)

دھند کے باوجود اسے اس کو پہچاننے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اپنی ازلی مسکراہٹ چہرے پر سجائے وہ بلاشبہ ارتضٰی عثمان ہی تھا۔ ''ارتضٰی مجھ سے پٹو گے تم'' مومل تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس کی طرف بڑھی تھی۔ ''تم غصے میں بالکل بِل بتوڑی لگتی ہو مومی'' شرارت سے بھرپور لہجے میں جواب ملا تھا۔ مومل نے پاؤں سے جوتا اتار کر اسے مارنا چاہا، یکا یک دھند کی تہہ بہت گہری ہوگئی۔ اس کے اردگرد بس دھند ایک سفید چادر تھی، ہر منظر اوجھل ہو چکا تھا۔ ارتضٰی! ارتضٰی! تم کہاں ہو؟ وہ چلاّئی تھی۔ دھند چھٹ چکی تھی، منظر لوٹنے لگے تھے مگر۔۔ مومی کے لبوں سے ایک زوردار چیخ آزاد ہوئی تھی۔ مومل بیٹا کیا ہوا، ڈر گئی ہو نیند میں؟ اس کی امی اٹھ کر اس کے پاس آئیں۔ اس کی پیشانی عرق آلود تھی، ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ ''مما! ارتضٰی'' وہ سسک کر اپنی ماں کے کندھے سے جا لگی۔ ''وہ بالکل ٹھیک ہے بیٹا! ابھی رات تو فون آیا تھا اس کا۔ اب سو جاؤ میری جان'' اس کی ماں نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا تھا۔

۱۷ اپریل ۲۰۱۲ ساتھ چھوڑ جانے کا دن؛ ایک قیامت آ کر گزر گئی۔ سویا ہوا گلیشئر جاگ گیا تھا۔ پاک آرمی کا بیس کیمپ شدید ایوالانچ کی زد میں آ گیا تھا۔ گیاری سیکٹر پہ موجود ۱۴۰ جوان برف کی دبیز تہہ میں دفن ہو گئے۔ ان کی آنکھوں کے آگے ابدی تاریکی چھا گئی تھی۔ زندگی کہیں بہت دور، بہت پیچھے رہ چکی تھی۔ اپریل، جب دھرتی پر بہار اپنے جوبن پر ہوتی ہے مگر گیاری پہ یہ کیسی بہار آئی تھی۔ مٹی کی محبت بھی بعض دفعہ کتنا بڑا خراج مانگ لیتی ہے، لہو کا خراج۔ وطن کی حفاظت کی خاطر جان دینے والوں میں ایک نام کیپٹن ارتضٰی عثمان کا بھی تھا۔ برف کی قبروں میں سونے والے جوانوں کی باڈیز کی تلاش شروع کر دی گئی تھی لیکن موسم کی شدت سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔

Deep in our hearts you will always stay

Loved and remembered everyday

Loved with a love beyond telling

Missed with a grief beyond all tears

سفید کتبے پر لکھے الفاظ پڑھ کر مومی کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ آنسو ایک تواتر سے اس کا چہرہ بھگو رہے تھے۔ اس نے بے اختیار سامنے کھلے لالہ کو دیکھا، دل میں کہیں ایک سکون سا اتر گیا تھا۔ موت جو اسے اپنے مقررہ وقت اور مقررہ جگہ پر ہی آنی تھی، کیسے روپ میں آئی کہ وہ امر ہو گیا۔ وہ یہیں اس کے آس پاس موجود تھا، بس وہ اسے دیکھ نہیں سکتی تھی۔ اور وہ جانتی تھی کہ شہید کبھی مرتے نہیں!!

اس کا ایک ایک لفظ دل کی گہرائی سے لکھا گیا ہے، شاید اسی جذبے کا نام محبت ہے !!!!

صبا عارف
10-ME

چاہت کے سنگ سنگ

چوکھٹ کے بیچ وہ آج پھر سے بیٹھی تھی، کبھی کبھی ہم چوکھٹ پر کسی کے انتظار میں نہیں بلکہ راستے بند کرنے کے لیئے بیٹھے ہوتے ہیں۔
روشنا؟ روشنا بیٹی یہاں کیوں بیٹھی ہو۔ایسے ہی ماما تھوڑی دیر تک اٹھ جاؤں گی۔ماں تھی، جانتی تھی وہ آج واقعی اٹھ جائے گی۔پھر چپکے سے خشک آنکھوں کے ساتھ وہ وہاں سے اٹھ گئی، آنکھیں بھی عجب شے ہیں رونے پہ آئیں تو ماتم ہی ختم نہیں ہوتا۔اور جو طوفان رکنے کے بعد خشک ہونے پہ آئیں تو ویران کھنڈروں کی طرح خشک سالی ایسے ڈیرے ڈالتی ہے جسے وہاں کبھی برسات ہوئی ہی نہ ہو۔

اس نے جائے نماز بچھالی۔۔۔نفل پڑھ کر سجدے میں گڑگڑاتی رہی۔۔۔آج یہ گڑگڑانا کسی کے مانگنے کے لیئے نہیں تھا ۔آج یہ گڑگڑانا 'اس' کی چاہ میں تھا۔
'تو نے بچالیا مجھے میرے مالک، تو نے بچالیا۔۔۔میں غلط تھی، سراب کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔میں نے آج تک تیری کوئی بات نہیں مانی، تو میرے گناہوں کو مت دیکھ تو دیکھ ناں میں تیرے حبیب ﷺ کی امت سے ہوں۔مجھے معاف کر دے مالک۔۔۔تو تو کن فیکون ہے ناں۔۔۔مجھے پھر سے تھام لے۔۔۔مجھے کچھ نہیں بس تیرے فضل، تیرے کرم کا ہاتھ چاہیے۔

کیا یہ ضروری ہے کہ عشق حقیقی کے لیئے عشق مجازی ہو؟
اس نے کہا تھا 'میرے خیال سے یہ ضروری ہے، جب تک کوئی آ کے یہ نہیں کہتا کہ 'آئی کانٹ لیو ود آوٹ یو ڈارلنگ'، روز رات ایسے راگ الاپے جاتے ہیں، اور جب تک وہی شخص ہمیں لات مار کے اپنی زندگی سے نکال نہیں دیتا ہم عشق حقیقی نہیں کر پاتے، پھر ہمیں سجدے یاد آتے ہیں، گڑگڑانا یاد آتا ہے، ہمیں اعمال کا بھاؤ تاؤ کرنا یاد نہیں آتا ہے، ہم رب سے لین دین کرتے ہیں۔۔۔اللہ ہم نے فلاں نیک کام کیا تھا اس کے بدلے ہمیں یہ دے دو۔۔۔۔اور پھر وہ ذات ہمیں وہ نہیں دیتی بس اپنی طرف بلائے جانے کا پیغام دیتی ہے ہمیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا ہوتا اس وقت۔۔۔ لیکن ایک وقت ایسا آتا ہے جب ہمیں اس مرکز کے گرد گھومنا ہوتا ہے۔۔۔وہ مرکز جہاں ہمیں رب مل جاتا ہے، جس کی محبت چھننے کا ڈر نہیں ہوتا۔وہ جس کی طرف ایک قدم بڑھاؤ تو وہ تھام لیتا ہے۔اس مرکز تک جانے کے لیئے ہمیں دنیاوی محبت کی ٹھوکر لگنا ضروری ہوتی ہے۔'

کیا تھی تم روشنا رحمان؟؟ اتنی پستی؟؟ گناہوں کی ایسی دلدل۔۔۔
یہ وہ روشنا تو نہیں جو کمرا کڑا کر کہتی تھی 'پاکیزہ عورتوں کے لیئے پاکیزہ مرد ہوتے ہیں اور روشنا رحمان نے اپنے آپ کو بہت پاکیزہ رکھا ہوا ہے۔'
تو پھر یہ سب کیوں؟ کیا تمھیں عمر ستار سے اپنی پاکیزگی سے زیادہ محبت تھی؟؟ یا پھر مان لو روشنا رحمان کے تم 'اس' کے دربار میں کبھی پاکیزہ تھی ہی نہیں۔آج سے تین سال پہلے کیے جانے والا سوال اس نے پھر ایک بار خود سے پوچھا تھا۔۔

تحریک ایک خاموش آواز اور قلم ہاتھ کی آواز ہے۔(سقراط)

تمہاری اتنی وفا، اتنی محبت کے بدلے عمر ستار کا یہ تھپڑ کافی تھا کہ تم میری نظروں میں گری ہوئی لڑکی ہو۔اور آج تمھیں رب یاد آ رہا ہے؟؟ وہ پھر سے اٹھی اس نے پھر سے سر سجدے میں رکھ دیا۔'میں نہیں اٹھوں گی اس وقت تک جب تک جب تک تو مجھے معاف نہیں کرے گا، میں نہیں اٹھوں گی۔'

اسے ایسا لگ رہا تھا کوئی اسے گھسیٹ کر اسے دربار سے باہر پھینک دے گا مگر اسے دربار سے باہر نہیں پھینکا گیا اسے سکون بخش دیا گیا اور اس دن اسے احساس ہوا تھا۔

'ہم میں سے بہت سے لوگ رب 'کو' ماننا چاہتے ہیں لیکن کوئی بھی رب 'کی' نہیں ماننا چاہتا۔یہ 'کو' سے 'کی' تک کا سفر بہت پراسرار ہے۔۔۔۔یہ تن سے من تک کا سفر ہے۔لیکن اگر ہم 'کو' چھوڑ کر صرف 'کی' کی طرف آ جائیں تو یہ لمحوں میں طے کیا جا سکتا ہے۔شاید ہم میں سے کوئی یہ ماننے کو تیار ہی نہیں کہ ہم میں سے بہت سوں کے من ملے ہیں۔۔۔اگر ایک اعتراف کر لینے سے رب مل جاتا ہے تو چھوڑ دیجیئے دنیاوی محبتوں کا پیچھا! سفر رائیگاں نہیں جائے گا، اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ دنیا کے سامنے چرچا کر کے اپنے جگ ہنسائی کرتے ہیں یا وہ محبت چپ چاپ دل کے نہاں خانوں میں سنبھال کر رکھ لیتے ہیں۔'اور جہاں تک رہے عمر ستار تم 'میں نے تمھیں معاف کیا۔۔۔

جب میں ہر گناہ کے بعد اس ذات سے معافی مانگتی ہوں اور یہ بھی چاہتی ہوں کہ وہ مجھے معاف کر دے تو میری یہ اوقات نہیں کہ میں تمہیں معاف نہ کروں۔مجھے میری حیثیت اور اصلیت کا ادراک ہوا ہے۔اس نے آنکھیں موند لیں تھیں وہ جانتی تھی کہ اس کا سفر بھی رائیگاں نہیں گیا ہے، دور کہیں فجر کی اذانیں اسے زندگی کا پیغام دے رہی تھیں۔

سادگی ایمان کی علامت ہے۔(حدیثِ نبویؐ)

محمد شبیر چوہان
10-CP

آخری پچھتاوا

آسمان پر سرخی بڑھ رہی تھی۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف رواں دواں تھے۔شام کا دھندلکا بڑھنے لگا تھا۔دن کا شور آہستہ آہستہ تھم رہا تھا اور ہر طرف اندھیرا اور خاموشی چھا رہی تھی۔دن کے سارے کام ختم کرنے کے بعد میں اپنے کمرے میں بیٹھا ڈائری میں کچھ لکھ رہا تھا کہ اچانک میری نگاہ دراز میں پڑے اس خط پر پڑی جو ابا جان نے پانچ برس قبل جب میں یونیورسٹی میں تھا تب لکھا تھا۔خط دیکھتے ہی میں آبدیدہ ہو گیا۔میری آنکھوں سے آنسوؤں کی اک جھڑی جاری ہو گئی جس سے خط پہ لکھے سارے الفاظ پھیکے پڑ گئے بس اک لفظ واضح نظر آ رہا تھا جس نے مجھے ساری زندگی کے لیے مجرم بنا دیا۔

انسان کتنا خودغرض ہے کہ اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے کتنے بڑے بڑے اور پیار کرنے والے دل توڑ دیتا ہے۔انکے جذبات کے ساتھ کھیلتا چلا جاتا ہے۔انکی قربانیوں کو بھلا دیتا ہے کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہوا۔آج میرے پاس سب کچھ ہے لیکن میں اکیلا ہوں۔مجھے زندگی ادھوری لگتی ہے۔پچھتاوا میری زندگی بن چکا ہے۔میں جب اکیلا بیٹھتا ہوں تو میری نظر کے سامنے میرے ابا جان کا وہ منتیں کرتا چہرہ کہ بیٹا۔۔۔میں نے آپکو ساری زندگی سب کچھ عطاء کیا،آج میں تم سے کچھ مانگنا چاہتا ہوں۔مجھے دو گے نا تم میں جو کچھ مانگوں؟۔۔۔میں انکی یہ باتیں بے رخی سے سن رہا تھا۔۔۔وہ مجھے عاجزانہ نصیحت کر رہے تھے کہ اک باپ اپنے چار، چار بچوں کو اچھی تعلیم،اچھی دیکھ بھال،اچھی خوراک اور اچھا پہناتے ہیں جبکہ چار بیٹے اکٹھے ہو کر بھی ماں باپ کے ارمانوں کو پورا نہیں کر سکتے۔

میرے کانوں میں آج بھی وہ الفاظ گونج رہے ہیں جو میرے باپ نے مجھے گھر چھوڑتے سمے کہے!!

!!بیٹا! جس عمر میں بیٹے اپنے باپ کو سہارا دیتے ہیں اس عمر میں تم مجھے اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہو۔ مجھے اس وقت بالکل پچھتاوا نہیں ہوا کیونکہ میں خودغرض ہو چکا تھا۔

میرا باپ اک مڈل کلاس ٹیکسی ڈرائیور تھا۔سارا دن اسلام آباد کی سڑکوں پر ہمارے لیے کچھ کمانے کے لیے بڑی گاڑیوں والوں کی باتیں، پولیس کانسٹیبل کی گالیاں اور مسافروں کی باتیں سن سن کر شام کو واپس آ جاتے۔وہ مجھے انجینئر بنانا چاہتے تھے۔انکی دعائیں رنگ لائیں اور مجھے انجینیئرنگ یونیورسٹی ٹیکسلا میں داخلہ مل گیا۔میرے ابا بہت خوش تھے کہ چار سال بعد انکی ساری تکالیف دور ہونے والی تھیں۔میں تعلیم میں بہت اچھا تھا۔ہمیشہ اچھے گریڈ لیتا تھا جس کی وجہ سے سب میری عزت کرتے تھے۔یونیورسٹی میں تیسرے سال مجھے مینا ہل قریشی سے پیار ہو گیا وہ بیوروکریٹ کی بیٹی تھی،وہ اکثر میرے سے کچھ نہ کچھ سیکھنے آتی تھی اور اس طرح ہم ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔وقت اور کچھ عہد و پیمان کے بعد ہم نے زندگی ساتھ گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔یونیورسٹی میں ٹاپ کرنے کے گھمنڈ نے مجھے یہ بھلا دیا کہ میں اک عام ٹیکسی ڈرائیور کا بیٹا ہوں اور وہ اسلام آباد کے ایلیٹ کلاس گھرانے کی بیٹی۔اسکی زلفوں کی اندھیری رات میں مجھے کچھ نہ دکھائی دیا سوائے اسکے جگنو کے سے چہرے کے جسکی ہلکی سی چمک میں مجھے اپنی تقدیر دکھائی دی اور میں اس پہ فدا ہونے کو تیار ہو گیا۔

پھر کچھ دنوں بعد ابو کا خط آیا جسے میں نے میس بل کے واؤچر سے بھی زیادہ حقارت کی نگاہ سے دیکھا اور گھر روانہ ہو گیا۔

مسکراہٹ محبت کی زبان ہے۔(ہومر)

شام کا کھانا کھا رہے تھے کہ ابا نے انتہائی معذرتانہ لہجے میں مجھے اپنے دوست کی بیٹی سے شادی کا کہا۔شادی کا نام سنتے ہی میں آگ بگولا ہو گیا اور ابا کو کھری کھری سنا دیں کہ مجھے آپکے دوست کی بیٹی سے شادی کا کوئی شوق نہیں۔میرا باپ میرے سامنے بالکل بے بس کھڑا تھا اور آج پھر میں اپنی حیثیت بھولے بولے جا رہا تھا۔سارے گھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے اپنے انجینئر ہونے پہ فخر تھا۔میں نے ابا کو انکی اوقات یاد دلائی اور گھر سے چل دیا،اک ایسی منزل کی جانب جو میرے خوابوں سے بھی اونچی تھی۔جس کے تانے بانے تک شاید میری سوچ بھی نہ پہنچ سکتی تھی۔میں اپنی دنیا جو بہت چھوٹی مگر بہت پیار کرنے والی تھی چھوڑ کر اک ایسی دنیا کی جانب چلا جسے صرف سوچا جا سکتا تھا جس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔میں پاگل ہو چکا تھا اک انسان کیلیے !

مناہل کے گھر جا کر معلوم ہوا کہ پچھلے پیر کو علی حیدر جو ایک سیاستدان کا بیٹا ہے، سے منگنی کر چکی ہے۔یہ خبر میرے دماغ پہ پتھر کی طرح لگی،اک ایسے پتھر کی طرح جس کا درد مجھے زندگی بھر ہونا تھا۔آسمان میرے اوپر گھوم رہا تھا میری دنیا ختم ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔میرے قدم میرا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔میں کہاں جا رہا تھا مجھے کچھ خبر نہ تھی بس میں چلا جا رہا تھا کہ اک کار حادثے نے مجھے ہسپتال پہنچا دیا۔

جب مجھے ہوش آیا اور میں نے آنکھ کھولی تو میں نے اپنے ساتھ والے سٹریچر پر ابو کو پایا۔انکی رکی ہوئی آنکھیں مجھے بہت پیار سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھے جا رہی تھیں۔آنکھوں سے آنسوں نکلنا اب مکمل طور پر بند ہو چکے تھے۔انکی نظروں میں ذرا بھر بھی گلہ نہ تھا۔وہ مجھے آنکھ بھر کہ دیکھ رہے تھے۔

آج انکی نظروں کے سامنے میرے پاس چھپنے کی جگہ نہ تھی۔وہ مسلسل مجھے دیکھے ہی جا رہے تھے اور میں پچھتاوے اور ندامت کے سمندر میں ڈوبا جا رہا تھا۔میں اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔میری آنکھیں ندامت سے جھکی جا رہی تھیں۔

آج اک شفیق باپ نے اپنا خون دے کر اپنے خون کو بچا لیا تھا،آج اک خود غرض بیٹا جسکی ساری زندگی ندامت سے عاری تھی پچھتاوے کی آندھی کے سامنے بے بس تھا مگر آج کا آخری پچھتاوا اسے ہمیشہ یاد رہے گا۔

کچھ مزاحیہ!

بیک وقت

اِدھر ہم سے محفل میں نظریں لڑانا
اُدھر غیر کو دیکھ کر مسکرانا
یہ بھینگی نظر کا نہ ہو شاخسانہ
"کہیں پہ نگاہیں" کہیں پہ نشانہ"

پٹہ

حافظ علی رضا
10-CP

سارا دن سخت دھوپ میں محنت مشقت کرنے کے بعد جب اس کا انگ انگ زخم کی طرح دکھنے لگا تھا اور پسینہ پونچھ پونچھ کر اس کے ماتھے پر رگڑ کے نشان بن چکے تھے اور ۲۰۰ روپے اسکے ہاتھ میں تھما کر مالک احسان صاحب نے بہت احسان بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا کہ ''بشیر میاں! کتا جب تک مالک کا وفادار رہتا ہے پوری روٹی کھاتا ہے''۔ اور بشیر نے پالتو کتے کی طرح ممنونیت سے دیکھتے ہوئے گردن ہلا دی۔ سارے راستے وہ سوچتا آیا کہ غریب اور کتے میں کیا فرق ہے؟ کتے کا کام وفاداری کرنا تھا اس کا بھی یہی کام تھا۔ کتے کے گلے میں پٹہ ہوتا ہے مگر اس کے گلے میں بھی تو پٹہ تھا جو سانس بھی احسان صاحب کے احسان سے آنے دیتا تھا!!! ۲۰۰ روپے کا پٹہ!! گھر کا دروازہ سامنے تھا۔ دروازہ کیا تھا لکڑی کا ایک شہتیر اٹکا کر رکھا ہوا تھا۔ جب اندر داخل ہوا تو احمد دیوار کے ساتھ اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ احمد اس کا بیٹا تھا جس کے پیدا ہوتے ہی گھر میں ایک وقت کی روٹی کم ہوگئی تھی۔ سانولے رنگ کا پستہ قد بدنصیب احمد۔ مزدور بشیر کے آنگن میں آیا تو بشیر کی آنکھوں کے حلقے گہرے ہو کر گڑھے بن چکے تھے اور پیشانی پر شکنوں کے جال گہرے ہو چکے تھے۔ نہ احمد کو احسان صاحب کے بچوں کی طرح اچھے اور نئے کپڑے نصیب ہوئے اور نہ ہی رنگ برنگے کھلونے۔ اب احمد کو سینہ پکڑ کے لیٹے دیکھ کر بشیر کے چہرے پر سایہ لہرایا۔ وہ بھاگ کر اس کے پاس گیا اور پوچھا تو اس نے کہا کہ سینے میں درد ہے۔ بشیر کے گلے میں ۲۰۰ روپے کا پٹہ تنگ ہونے لگا۔ اس نے کہا کہ فکر نہ کرو بیٹا! میں کسی ڈاکٹر کو دکھاتا ہوں۔

بشیر احمد کو لے کر بستی کے نکڑ پر بنے ایک ڈاکٹر ارسلان کے کلینک پر گیا۔ ڈاکٹر ارسلان المعروف قصاب، سرخ و سفید رنگت اور چوڑے چکلے بدن کا مالک تھا۔ مریض کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کی سرخی اور بڑھ جاتی تھی۔ اور وہ غریبوں کی خدمت کے لیے فوراً تیار ہو جاتا تھا۔ احمد کو دیکھ کر اس کی رال ٹپکنے لگی تھی۔ آج ڈاکٹر صاحب کی بیٹی نے سونے کے نئے کنگنوں کی فرمائش کی تھی اور احمد خدا کا بھیجا ہوا عطیہ!!

ڈاکٹر نے چیک کرنے کے بعد کہا کہ دل میں سوراخ ہے۔ آپریشن بہت ضروری ہے۔ آپریشن کا سن کر بشیر کے ذہن میں آندھیاں چلنے لگیں۔ ڈاکٹر بتا رہا تھا کہ ۷۰۰۰۰ روپے لاؤ تو آپریشن ہوگا ورنہ بیٹا نہیں بچے گا، بشیر سن کر رونے لگا کہ وہ غریب آدمی ہے اور یہی بیٹا اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہے، امیدوں کا چراغ ہے۔ مگر ڈاکٹر نے انکار کر دیا اور بشیر کو دھکے دے کر نکلوا دیا۔ ۲۰۰ روپے کا پٹہ تنگ ہو رہا تھا۔ بشیر کو احسان صاحب یاد آئے۔ اسکو یاد آیا کہ احسان صاحب کے بیٹے کی سالگرہ پر انہوں نے اسے ایک نئے ماڈل کی کار لے کر دی تھی اور بیٹی کو لاکھوں روپے مالیت کے کنگن۔ ۷۰۰۰۰ تو معمولی رقم ہے۔ وہ جیسے تیسے کر کے احسان صاحب کے پاس پہنچا اور اپنی مصیبتوں کا ذکر کیا تو احسان صاحب سن کر غصے میں آ گئے اور برس پڑے ''دفع ہو جاؤ میں نے کوئی خیراتی ادارہ نہیں کھولا ہوا جو یوں پیسے ضائع کرتا جاؤں۔ بشیر میاں کتے اور انسان میں زیادہ فرق نہیں ہے۔ سمجھایا تھا مگر تم نہیں مانے اور دفع ہو جاؤ۔''

طاق میں رکھے چراغ میں تیل ختم ہونے کے باعث اسکی لو آخری سانسیں لے رہی تھی اور دھواں فضا میں کثافت پیدا کر رہا تھا۔ اور تاریک شب میں ایک اور غریب کے گھر میں تاریکیوں نے ڈیرا جما لیا تھا۔ احمد سارے شہر کے ہسپتالوں کی سیر کے بعد اس دنیا سے، غربت کے قید خانے سے آزاد ہو چکا تھا۔ اور پر سکون لیٹا ہوا تھا۔ بشیر کے آنسو تو بہت پہلے ہی خشک ہو چکے تھے۔ باہر سے کچھ پرندوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں شاید غریب کی مرگ پر نوحہ پڑھ رہے ہوں گے کیونکہ لوگ تو بہت کم آتے ہیں جب دیگ نہ پکے اور چاول نہ بٹیں تو نوحہ کے لیے لوگ کہاں سے آئیں؟؟ بالآخر احمد ابدی آرام پا گیا۔ اور گھر میں ایک وقت کی روٹی پھر سے بچنے کے آثار پیدا کر چکی تھی۔ اور بشیر کچھ دن بعد پھر پٹہ پہننے کی تیاری کرنے لگا !!!

جو ہمارے دل میں ہوتا ہے ہمیں وہی دکھائی دیتا ہے۔ (گوئٹے)

قربانی

فاران حسن
10-EE-167

اس کی گہری آنکھیں چمکدار، روشن اور شفاف تھیں۔ ٹھہری ہوئی پرسکون، خاموش آنکھیں اس کی شخصیت کو جاذب بناتی تھیں۔ اس کی کھوئی کھوئی نگاہیں اپنے اردگرد کے مشاہدے سے زیادہ خلا میں کسی نادیدہ شے کو تکتی تھیں۔ آنکھوں کی طرح اس کی شخصیت میں بھی ٹھہراؤ تھا۔ چہرے کی مجموعی ہیت سے وہ بے نیاز سا اپنی ہی سوچوں میں گم بانکا نوجوان لگتا تھا۔ چہرے کی ہلکی سی معصومیت اسے پرکشش بناتی تھی۔ نوجوان کا قد کافی لمبا تھا اور بھیڑ میں اسے اور بھی نمایاں کرتا تھا۔ چمڑے کی جیکٹ اس کی دراز قامتی پر خوب جچتی تھی۔ اسکا لباس سادہ سا تھا اور لگتا تھا کہ وہ اپنے حلیے اور ظاہری حالت پر خاص دھیان نہیں دیتا۔ ماتھے پر بکھرے بے ترتیب بال اور ہلکی سی بڑھی ہوئی شیو اور مونچھیں گو کہ اسے الجھا ہوا ظاہر کرتیں مگر مجموعی طور پر وہ مہذب لگتا تھا۔ دسمبر کی اس رات سردی معمول سے کچھ زیادہ ہی تھی۔ نوجوان نے شاید سردی محسوس کی اور اپنے جیکٹ کے کالر کھڑے کر لیے۔ پینٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے وہ اس شور اور پرہجوم ماحول سے بالکل الگ لگتا تھا۔ خاموش اور اکیلا۔ اس کے اردگرد رات کو بھی زندگی بیدار اور ہشاش بشاش ڈور رہی تھی لیکن نوجوان خاموشی سے اپنے آپ میں گم کھڑا تھا۔

یہ لاہور کا ریلوے سٹیشن ہے۔ چوبیس گھنٹے بیدار۔ پھیلا ہوا، بے باک، پرجوش اور ہنس مکھ سٹیشن جو کہ اپنے اندر ہی ایک ثقافت ہے۔ اس کی اپنی ہی الگ دنیا ہے۔ مسافروں کی دنیا۔ یہ بے چین بھی ہے اور پرسکون بھی، خوشی بھی ہے اور غم بھی مگر خوشی کا تناسب غم سے زیادہ۔ بھانت بھانت کے لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہوئے اس میں ادھر ادھر پھرتے ہیں۔

یہ رات کے تقریباً نو بجے کا وقت تھا۔ زیادہ تر لوگ بینچوں پر سکڑے سمٹے بیٹھے تھے۔ جا بجا چائے کے ڈھابوں پر بلا کا رش تھا۔ نوجوان نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور چائے کے ایک سٹال کی طرف بڑھ گیا۔ اس کی چال میں متانت تھی اور ایسا ٹھہراؤ گویا کوئی پرسکون اور گہری لہر بنا آہٹ کے چلتی ہے۔ چائے کا آرڈر دے کر نوجوان بنچ پر بیٹھ گیا۔ گرم گرم چائے کا بھاپ ہوا میں بے ہنگم مرغولے بنا رہا تھا۔ نوجوان غور سے ان مرغولوں کو دیکھنے لگا۔ دھویں کے مرغولے بھی عجیب چیز ہیں۔ بیک وقت کئی شکلیں بناتے ہیں۔ اپنے تخیل کے زور پر جو چاہو بنا لو ان سے۔ لیکن حقیقت میں کچھ بھی نہیں۔ جلد ہی ہوا میں تحلیل ہو کر فنا ہو جاتے ہیں بالکل زندگی کی طرح۔ نوجوان کے ساتھ والی بنچ پر چند پولیس والے بیٹھے زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ سگریٹ پھونکتے ہوئے متفکر چہرے لیے وہ شاید آنے والے وقت سے خوفزدہ تھے اور موجودہ نظام سے خوش نہیں تھے۔ فضا میں نامانوس سا خوف در آیا تھا۔ بظاہر ہنستے مسکراتے چہرے نوجوان کو ڈرے سہمے لگنے لگے۔ سامنے سے ایک نوبیاہتا جوڑا گزرنے لگا۔ مرد نے کندھے پر بیگ لٹکایا ہوا تھا اور اس کے پیچھے سکڑی سہمی عورت جھجکتی ہوئی چل رہی تھی۔ مرد کے چہرے پر پریشانی اور عورت کے چہرے پر خوف تھا۔

آپ کی چائے۔۔۔!! ہوٹل کا ملازم اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ڈر کی ایک اور تصویر۔ لیکن اس تصویر میں بے بسی اور لاچاری کے رنگ کی بھی آمیزش تھی۔ گرم چائے کے گھونٹ سے اس پر سرور سا چھا گیا اور وہ چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ وردی والے افسر اٹھ کر جا چکے تھے۔

" آہم آہم " گلا کھنکھارنے کی آواز پر نوجوان چونک پڑا۔ ''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' جھریوں بھرا چہرہ اور بچے کی سی معصومیت لیے مسکراتی آنکھیں اس سے پوچھ رہی تھیں۔ جی بیٹھیے۔ ''شکریہ'' جواب آیا۔ نوجوان نے غور سے بیٹھنے والی شخصیت کو دیکھا۔ سرخ چہرہ، بھورے بال اور بے ترتیب سا میلا حلیہ۔ وہ یہاں کا رہنے والا نہیں لگتا تھا۔ اس کا سامان بھی عجیب اور دلچسپ تھا۔ بڑا سا سفری بیگ اور گلے میں لٹکتے دو تین کیمرے۔ اس نے چائے کا آرڈر دیا اور

اعتماد محبت کی پہلی سیڑھی ہے۔ (پریم چند)

نوجوان کی طرف دیکھ کر بولا ''ینگ مین کہاں کا ارادہ ہے؟'' نوجان چونک پڑا اور دھیرے سے مسکرا کر بولا ''کہیں نہیں۔ پڑھتا ہوں لاہور میں اور کبھی کبھی رات کو یہاں چہرے پڑھنے آجاتا ہوں''۔ بوڑھا بولا ''تمہارا لاہور بہت خوبصورت ہے۔خوش باش اور منافقت سے دور۔ یہ واقعی زندہ دلان کا شہر ہے۔ میں تین سال سے یہاں ہوں لیکن دل ہی نہیں بھرتا''۔نوجوان دلچسپی سے سن رہا تھا۔''آپ شاید ادیب یا شاعر ہیں؟'' نوجوان نے پوچھا۔ جواب میں گلا کھنکھارنے کے بعد بلند بانگ قہقہہ بلند ہوا ''میں سیاح اور ادیب ہوں اور سفرنامے لکھتا ہوں۔ اچھا کیا میں تمہاری تصویر لے سکتا ہوں؟'' بوڑھا کیمرا سیدھا کرتے ہوئے بولا۔(کھٹاک اور تصویر بن گئی)۔''اچھا یہ بتاؤ کہ اداس کیوں رہتے ہو تم؟'' بوڑھا اس کی گہری اور اداس آنکھوں میں جھانک کر بولا۔''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں''۔نوجوان شاید زیادہ ہی شرمیلا تھا۔

بوڑھا گلا کھنکھار کر اور سر ہلا کر بولا ''مجھے تم لوگوں کی یہی بات پسند ہے۔ یہی اپنی روایات سے جڑے رہنا۔قربانی کا جذبہ۔دوسروں کے لیے قربانی دینا، خاموشی، دھیما پن اور اپنی بڑائی چھپانا''۔نوجوان نے شاید موضوع بدلنے کو کہا ''آپ یہاں کے تو نہیں لگتے؟''

''نہیں میں یہاں کا نہیں ہوں۔ میں کسی بھی جگہ کا نہیں ہوں۔اولاد نے اولڈ ہوم میں ڈال دیا لیکن میں وہاں سے بھی بھاگ آیا۔وہاں بہت آرام تھا، ہر سہولت تھی۔لیکن میں بھاگ آیا۔ پتا ہے کیوں؟''

''جی کیوں؟'' نوجوان نے دلچسپی سے پوچھا۔

''عشق کی وجہ سے۔ مجھے سیاحت سے عشق ہے اور عشق قربانی مانگتا ہے۔ میں نے اپنے آرام وسکون کی قربانی دی۔ پروانے کو دیکھا ہے کبھی؟ اس کو پتا ہے کہ شمع سے وصل موت ہے مگر پروانہ قربانی دینا جانتا ہے اور جل جاتا ہے۔تمہاری آنکھوں میں بھی قربانی ہے، قربانی کا جذبہ ہے''۔

نوجوان سر ہٹا کر بولا ''یہ کوئی بڑی بات نہیں، ہم سب یہاں یہی جذبہ رکھتے ہیں''۔

''نہیں بیٹا! سب نہیں! اگر تم سب قربانی دینا جان جاؤ تو کون بھلا تم لوگوں کو کامیابی سے روک سکتا ہے۔آج تمہاری یہ حالت اسی لیے ہے کہ قربانی کا جذبہ ختم ہوتا جا رہا ہے''۔

نوجوان گھڑی دیکھ کر کھڑا ہوا اور بولا ''مجھے اجازت دیجیے، میں لیٹ ہو رہا ہوں۔ میں نے ابھی یونیورسٹی تک پیدل جانا ہے''۔ بوڑھے کا سر کچھ اور زور سے ہلنے لگا اور پرجوش انداز میں بولا ''مجھے خوشی ہوئی تم سے مل کر ینگ مین!'' پھر سرگوشی میں بولا ''یاد رکھو! عشق قربانی مانگتا ہے۔ پروانے کو مرنے سے کیا؟''

سٹیشن سے باہر لاہور اب اونگھنے کی تیاری کر رہا تھا۔نوجوان کے قدم اب تیز تیز چل رہے تھے۔نہر کے پل پر پہنچ کر اس نے ایک بار پھر جیکٹ کو درست کیا۔ ہر سو خاموشی تھی۔اچانک ایک چیخ کے ساتھ پانی میں چھپاکا ہوا۔''شاید کوئی بچہ گر گیا ہے نہر میں''۔یہی پہلی سوچ نوجوان کے دماغ میں ابھری۔ پل کا جنگلا جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا اور شاید بچہ اندھیرے میں اسی لیے نیچے گر گیا۔نوجوان تیزی سے جنگلے کی طرف بڑھا۔ نیچے پانی میں ہل چل مچنے لگی۔ بچہ شاید ہاتھ پاؤں مار کر خود کو ڈوبنے سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔نوجوان نے اسے بچانے کا سوچا لیکن اسے یاد آیا کہ اسے تو تیرنا بھی نہیں آتا ہے۔ایسے میں نہر میں چھلانگ لگا کر تیرنا تو درکنار خود اس کا ڈوب جانا بھی یقینی تھا۔ میں بھاگ کر اس کے لیے مدد لاتا ہوں۔لیکن یہ تو اسے بھی پتا تھا کہ مدد پہنچنے سے پہلے ہی بچہ ڈوب کر ہلاک ہو جائے گا۔''اے خدا! میں کیا کروں؟'' اسی ذہنی خلفشار میں گم اس نوجوان کو بوڑھے کی سرگوشی سنائی دی ''یاد رکھو! عشق قربانی مانگتا ہے۔ پروانے کو مرنے سے کیا؟ اسے تو وصل چاہیے۔ پروانے کو قربانی دینا آتا ہے''۔سرگوشی سن کر نوجوان نے لمحے بھر کو سوچا اور نہر میں چھلانگ لگا دی۔

ہر نیک کام اپنے لیے خود جگہ بنا لیتا ہے۔(ایمرسن)

محمد رضوان حیدر
10-CP-52

آنسو

سناؤں کیسے میں اپنی داستاں
خود ہی کے غم کروں کیسے بیاں

السلام علیکم !!

میرا نام آنسو ہے۔

میرے جسم کی کہانی اب سے بہت پُرانی ہے کہ جب حضرت انسان کو زمین پہ اُتارا گیا۔اُس وقت سے آج تک جب بھی کسی انسان نے اِس دُنیا میں جنم لیا تو وہ روتا ہوا آیا،بس اُسی وقت ہی میں اِس انسان کی زندگی میں شامل ہو گیا۔ٹھہریئے!!! میں اپنا پورا تعارُف کراتا ہوں۔

میں ہوں تو بظاہر ایک قطرہ ہی لیکن میرے اندر غم ،رنج، دُکھ، درد، غصہ، خوشی، ہنسی، مذاق سب پائے جاتے ہیں اور ان سب کے بغیر میں ادھورا ہوں۔آنکھ میرا گھر ہے اور میرے کئی رِشتہ دار بھی ہیں، جن کا تذکرہ بعد میں آئے گا۔میں با آسانی کہیں بھی پہنچ جاتا ہوں اور جہاں جہاں لوگ میری آہٹ پاتے ہیں تو اِن کے دِل مَغموم ہو جاتے ہیں اور اُن کی آنکھوں سے میں ٹپکنے لگتا ہوں۔

لوگ چاہتے ہیں کہ میں ہمیشہ کیلیئے اُن کی زِندگی سے چلا جاؤں۔لوگ ہمیشہ مُجھے کوستے ہی رہتے ہیں۔مُجھ سے بہت ہی کم لوگ پیار کرتے ہیں حالانکہ میں بھی اللہ تعالی کی بنائی ہوئی شے ہوں۔مُجھ سے مایوس نہیں ہونا چاہئے بلکہ میرا مقابلہ کرنا چاہئے کیونکہ میں زیادہ دیر تک کسی کی آنکھ میں نہیں ٹک سکتا۔میرا تعلق دل اور اِحساس دونوں سے ہے۔اگر یہ دونوں میری زِندگی میں نہ ہوں تو میں کسی بھی انسان کی آنکھ سے باہر نہ آپاؤں۔

خیر میں آپ لوگوں کو بتاتا ہوں کہ جہاں لوگ مُجھ سے نَفرت کَرتے ہیں وَہاں بعض لوگ مُجھ سے محبت بھی بہت کرتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ اُن کی زندگی میں آنسوؤں اور دُکھ درد کے سِوا اور کُچھ بھی نہ ہو۔لیکن ایسے لوگ بہت کم پائے جاتے ہیں۔

میں اُردو ادب میں شعروشاعری اور افسانہ نگاری کی زینت سمجھا جاتا ہوں اور مُجھے سب سے زیادہ تقویت محبوب اور عاشق کے رِشتے سے ہی ملتی ہے ۔چونکہ ہجر کی گھناؤنی راتوں میں، میں ہی ان کا سہارہ ہوتا ہوں۔اس لئے ایسے لوگوں کے ہاں میری بہت اہمیت ہے۔ بڑے بڑے شاعر جیسے علامہ اقبال،

جس نے اسلام قبول کرلیا اس نے فلاح پائی۔(قائداعظم محمد علی جناح)

میر انیس، مرزا غالب، میر درد، میر تقی میر تقریباً سب نے مُجھے اپنے اشعار میں عزت دی ہے۔ اردو ادب میں میرا مقام بہت اعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔ میرے بغیر شعر و شاعری کا درجہ پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ پاتا۔ مجھے لوگ خوشی، غم، دُکھ کی حالت میں بہت یاد رکھتے ہیں۔ جیسے کہ ایک شاعر نے اپنے رنج و غم کا اظہار کچھ اِس طرح یاد کیا ہے:

قلم چلتی ہے تو دل کی آواز لِکھتا ہوں
غم اور جُدائی کے اندازِ بیاں لکھتا ہوں
رُکتے نہیں ہیں میری آنکھوں سے آنسو
میں جب اُس کی یاد میں الفاظ لکھتا ہوں

میرے سب سے خطرناک رشتہ دار کا نام " مگر مچھ " ہے۔ یہ وہ نہیں جو ایک خونخوار جانور کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ میرا رشتہ دار لوگوں میں اکثر " مگر مچھ کے آنسو " کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسکا جنم اس وقت ہوا۔ جب شیطان نے حضرت آدمؑ اور اماں حواؑ کو دھوکہ دے کر جنت سے باہر نکالنے کی کوشش کی۔ ایسے آنسوؤں سے بچ کے رہئے گا اِس کا کام لوگوں کو دھوکہ دینے کے سوا اور کُچھ نہیں۔

جب لوگ اِس دُنیا میں جنم لیتے ہیں تو بھی مُجھے یاد کرتے ہیں اور جب دنیا سے جانے لگتے ہیں تب بھی مُجھے ہی یاد رکھتے ہیں نیز میں لوگوں کی زندگی میں ابتداء سے انتہا تک شامل ہوں اور مُجھے کوئی نہیں بُھلا سکتا۔ میرا سب لوگوں کو یہی پیغام ہے وہ مُجھے اُس وقت بھی یاد کریں جب خوشی بھی آپکی زندگی میں آئے نہ کہ اُداسی۔ اور اپنی زندگی میں ہمیشہ سُکھی اور آباد رہیں۔

آپ سب کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے میری آپ بیتی سُنی جِس سے میرے دل کا بُوجھ قدرے کم ہو گیا ہے۔
اچھا اب میں چلتا ہوں ورنہ آپ کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو جائیں گے۔ اپنا بہت خیال رکھیئے گا۔

فقط

آنسو

والسلام!!

عظمت صرف سچائی کو حاصل ہے۔ (جانسن)

محمد کلیم
09-ME-137

''کاش کہ یہ خواب ہوتا!''

زندگی اچھے اور برے واقعات کا نام ہے۔اچھا واقعہ جو ہر ایک کے ہونٹوں میں مسکراہٹ لاتا ہے اور اگر وہ خواب میں بھی نظر آئے تو نیند سے بیدار ہونے کے بعد سوچتے ہیں کہ یار! کیا یہ خواب تھا؟ برا سانحہ نا صرف اس کھلی آنکھ سے برا لگتا ہے بلکہ اگر خواب میں بھی آئے تو اٹھنے کے بعد خدا کو یاد کرتے ہیں کہ شکر ہے یہ خواب تھا۔بعض اوقات زندگی کے کسی موڑ پر آنے والے برے سانحہ کے بارے میں گمان کرتے ہیں کہ یہ خواب ہے۔لیکن یہی زندگی کی حقیقت ہے کہ ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔

24 مئی 2011 دوپہر ایک بجے میں دنیا کی رنگینی کا مزہ لے رہا تھا۔میرا موبائیل چار جنگ پے لگا ہوا تھا۔نا جانے کب سے میرا موبائیل چیخ چیخ کر بول رہا تھا کہ اے مجھے استعمال میں لانے والے اپنی زندگی کے بدلے رخ کی حقیقت کو جان۔لیکن میں لطف کے سمندر میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ مجھے پتا ہی نہ چل سکا کہ میرے موبائیل پے Message یکے بعد دیگرے آرہے ہیں۔اتنے میں میرے ساتھ بیٹھے دوست نے مجھے موبائیل پکڑاتے ہوئے کہا کہ ''کلیم Message آرہے ہیں''

Message کی تلخ حقیقت کچھ اس طرح تھی ''جہانزیب خالد کی death ہو چکی ہے انا اللہ وان الہِ راجعون۔اللہ ان کو جنت میں اعلیٰ مقام دے آمین۔۔۔''

اول تو مجھے اس پے یقین نا آیا۔میں نے فوراً کال ملانا شروع کی اگلا نمبر busy تھا۔میری بے چینی اور بڑھ گئی۔میں نے اپنے ایک اور دوست کا نمبر ڈائیل کیا۔وہ بھی مشغول تھا۔میرا تجسس یقین میں بدلتا جا رہا تھا۔مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میں کیا کروں۔میرے ذہن میں ایک اور نمبر آیا میں نے بسمہ للہ پڑھ کر نمبر ڈائیل کیا۔خدا کرنی ہوئی کہ بل جا رہی تھی۔دو تین گھنٹیاں بجنے کے بعد دوسری طرف سے آواز آئی ''ہاں کلیم کتھیں؟ (ہاں کلیم کہاں ہو؟)''

میں نے اس کے سوال کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔اور اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''ہاں یار جہانزیب دا سونڑا؟ (ہاں یار جہانزیب کا سنا کیسا ہے؟)'' اس نے کہا

''جنا نزیب فوت تھی گے۔اساں ویندیں پیے ہیں تساں وی آونجو۔اساں Sir Nazir anjum دی shop تیں پہنچ گے ہیں (جہانزیب فوت ہو گیا ہے ہم جا رہے ہیں تم بھی آجاؤ۔ہم نذیر انجم کی shop تک پہنچ گئے ہیں)''

میں نے ہانپتے ہوئے جواب دیا

''اتاں رکو۔اساں آندے پے ہیں (وہیں رکو۔ہم آرہے ہیں)''

ہم تین دوست پاؤں میں الٹی سیدھی جوتیاں پہنے روم سے نکلتے ہی دوڑنا شروع ہوئے۔دکان کے قریب وہ بھی یونیورسٹی کے گیٹ نمبر 2 کی طرف بھاگتے جا رہے تھے۔ہم نے اپنی رفتار بڑھائی اور ان کے قریب پہنچ گئے۔یونیورسٹی سے چند قدم کی دوری پر HMC مارکیٹ سے carry ڈبہ hire کیا اور اسے جلدی POF ہسپتال پہنچنے کو کہا۔گاڑی چل پڑی۔میں اس معصوم کے خیالوں میں ڈوب گیا۔میں اسی سوچ میں تھا کہ اچانک Carry ایک دھچکے سے رکی۔ٹوکن نہ ہونے کی وجہ سے گاڑی کو چوکی سے کراس نہ کرنے دیا۔ہم ڈرائیور پر غصہ ہوئے۔آگے جا کے ایک اور carry کو hire کیا اور تقریباً 15 منٹ میں POF ہوسپٹل پہنچ گئے۔ہم چھ دوست تھے۔سب اشک بار آنکھوں کے ساتھ دوڑتے ہوئے I.C.U (آئی۔سی۔یو) روم کی طرف پہنچے۔

کتاب وہ واحد چیز ہے جو ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔(روفس چوایٹ)

وہاں ہر ایک اس معصوم کی موت پر دھاڑے مار مار کر رو رہا تھا۔ وہ بھی آنکھوں میں آنسو لئے بیٹھا تھا جس نے کبھی اس معصوم سے بات بھی نہیں کی تھی ۔میری نظر اس لختِ جگر کی والدہ پر پڑی مارے غم کے اس کی آواز حلق سے باہر نہیں نکل رہی تھی۔ سب دوست اس محترمہ کو تسلی دینے کی غرض سے اس کی طرف لپکے میں بھی ساتھ جا کے بیٹھ گیا۔

اس مجبور اور بے بس خاتون کی حالت اس طرح تھی جیسے کسی نے اس کی سب سے بڑی دولت کھینچ لی لو۔ سچ ہے اولاد والدین کے لئے دولت سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے۔ اور پھر نوجوان لڑکا جس نے دن رات محنت و مشقت کے بعد انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہو اور آدھی ڈگری Complete ہونے کو تھی کہ وہ لقمہ اجل بن گیا ہو۔ ایسے نوجوان کے والدین کے ساتھ جو گزرتی ہے وہ صرف والدین کو ہی پتا ہوتا ہے دوسروں کے لئے صرف ایک آدھ گھنٹہ کے لئے دکھ ہوتا ہے۔ ان کے دکھ کو سمجھنا تو دور کی بات انکے غم کا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔

''میرا بیٹا تمہارے ساتھ پڑھتا تھا، تم سب اس کے ساتھ پڑھتے تھے، تم سب آ گئے ہو اسے بھی لے آؤ، میں نہیں جانتی مجھے بس کہیں سے میرا بیٹا ملا دو، میں نے اپنا بیٹا تمہارے پاس بھیجا تھا، وہ تمھارے ساتھ کھیلتا تھا، تم سب آ گئے ہو اسے بھی لے آؤ، ہائے میرا بیٹا، کتنے ارمان سے یونیورسٹی بھیجا تھا، جب گھر سے گیا تھا تو وہ ٹھیک تھا اب کیا ہو گیا ہے۔ کہاں ہے میرا بیٹا مجھے اس سے ملوا دو' یہ وہ فقرات تھے جو اس خاتون کے منہ سے نکل رہے تھے۔ ہم بھی اس کے ساتھ ساتھ رو رہے تھے۔ اور اسے تسلی بھی دے رہے تھے کہ ''ہم بھی آپ کے بیٹے ہیں۔ اللہ کی مرضی میں کس کی چلی ہے۔ بس آپ صبر کریں اس میں بھی خدا کی حکمت ہو گی۔''

مجھ سے اس کی یہ حالت دیکھی نہ گئی میں آئی۔سی۔یو روم کے بائیں طرف گیا وہاں اس کا والد آنسو میں شرابور تھا۔ سب اسے گلے مل کے تسلیاں دے رہے تھے۔ میں نے بڑی ہمت کی اور گلے ملتے ہوئے صرف یہ کہہ پایا ''بس اللہ کی مرضی تھی۔''

یونیورسٹی کی ایمبولینس کا انتظام کرایا گیا اور آدھ گھنٹے بعد ایمبولینس نے ہوسپٹل پہنچنا تھا۔ میں اندر سے ٹوٹ رہا تھا۔ دل چاہا کہ اس بے روح جسم کو دیکھ لوں۔ ہال کا دروازہ کراس کیا ہی تھا کہ ہمت نے ساتھ چھوڑ دی اور الٹے پاؤں میں واپس صحن میں آن کھڑا ہوا۔ کچھ دیر بعد ایک کلاس فیلو ظفر نے کہا ''آیا راسے دیکھ تو لیں'' اس مرتبہ میں نے ہمت کی اور اس کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اندر رش تھا۔ جو دیکھتا دھاڑے مار مار کر روتا، ہم نے باہر انتظار کرنا ہی مناسب سمجھا۔ کچھ دیر بعد جہانزیب کو اکیلا پا کر ہم آگے بڑھے۔ میرا دوست جہانزیب کپڑے سے پوری طرح ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے کپڑا اس کے چہرے سے الگ کیا۔ اس کا چمکتا چہرہ دیکھ کر ہماری آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے۔ میں غم میں نڈھال ہو گیا۔ قلب کی پمپنگ پورے جسم کو ہلا رہی تھی۔ دل کا درد چشم سے آنسوؤں کی صورت نکلنے لگا۔ دماغ میں دوڑتا خون رک گیا اور رگیں یوں جامد ہوئیں جیسے میرے سر پر کسی نے پہاڑ رکھ دیا ہو۔ پھر ہاتھ ہٹا کر اس کو دوبارہ دیکھا اور ہم روتے ہوئے آئی۔سی۔یو روم سے واپس آ گئے۔ باہر نکلتے ہی ایمبولینس کے پہنچنے کی خبر ملی۔ ہاسپٹل کی کاغذی کاروائی کے بعد Dead Body کو ایمبولینس میں شفٹ کیا گیا اور پھر جہانزیب کے آبائی شہر ''سرگودھا'' کی طرف روانہ کیا گیا۔

یونیورسٹی کی مسجد کے سپیکر سے آواز گونج رہی تھی۔۔۔''ایک ضروری اعلان سماعت فرمائیں۔ جہانزیب خالد 09 مکینیکل ڈیپارٹمنٹ from سرگودھا رضائے الٰہی سے وفات پا چکے ہیں۔ جن کی نمازِ جنازہ بعد نمازِ عشاء سرگودھا میں ادا کی جائے گی۔ اور اس کے لئے یونیورسٹی کی بس 3 بجے کمپیوٹر ڈیپارٹمنٹ کے سامنے سے روانہ ہو گی۔ تمام حضرات سے گزارش کی جاتی ہے کہ وقت کی پابندی کا لحاظ رکھتے ہوئے 3 بجے پہنچ جائیں''

2:50PM پے میں یونیورسٹی کی لیبریری کے پیچھے پہنچا جہاں بس کھڑی تھی۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے صرف ایک بس دی لیکن تعداد اتنی تھی کہ دو مزید Buses کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ لڑکوں نے ہمت نہ ہاری سب نے مل کر ویگنیں Hire کیں اور ہم سب سرگودھا کے لئے روانہ ہو گئے۔ سب لڑکے خدا کرنی کو یاد کر رہے تھے اکثر کو تو یہ واقعہ خواب لگ رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں کسی تنہائی میں جا کہ روؤں۔ لیکن غم دل میں ایسا بیٹھ گیا جیسے لکڑی میں دیمک بیٹھ جاتی ہے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ لکڑی کا نام و نشان مٹا دیتی ہے۔ آنکھوں سے بارش بہہ رہی تھی۔ اور دل کو کھاتے غم کے ساتھ میں ویگن میں بیٹھا تو تھا۔ لیکن دنیا و مافیا سے بے خبر اس کے قیاس میں کھویا ہوا تھا۔ اس وقت کسی اپنے کے سینے لگ کر جی بھر کر رونے کا دل کر رہا تھا۔ لیکن کس کو اپنا کہتا جو اپنا تھا وہ تو اس

شر کی اجازت شر ختم کرنے کے لیے بھی نہیں دی جا سکتی۔ (روز ویلٹ)

عالم میں مجھے یوں تنہا چھوڑ گیا جیسے جسم کو روح چھوڑ جاتی ہے۔رات آٹھ بجے ویگنیں شہر سرگودھا کے لاری اڈے سے گزریں۔ پندرہ منٹ کے وقت بعد ہم شہر سے کالونی میں ہوتے ہوئے گلیوں میں سے گزرے۔اور پھر ویگن میں بیٹھے جہانزیب کے چاچو نے پہنچنے کی خبر دی سب لڑکے باری باری اتر رہے تھے۔ پھر ہم ویگن سے اترنے کے بعد اس کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں بیٹھے ہر بندے کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ زاروقطار رو رہے تھے۔ دل میں درد پہلے بھی تھا اب اس قدر اٹھا کہ پورے جسم کو ہلا کر رکھ دیا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ درد میری روح کو میرے جسم سے آزاد کرے گا۔ایسے واقعات پر جب درد برداشت سے باہر ہو جائے تو ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ اس دنیا سے کوچ کر جائیں۔ دنیا تو ہے ہی غم و دکھ کا گھر۔اس غم و دکھ کے گھر میں رہنے کو دل نہیں چاہتا۔ہم چاہتے ہیں کہ ہم ایسی دنیا میں رہیں جس میں یہ بیماریاں نہ ہوں۔اس فانی دنیا میں تو یہی کچھ ملتا ہے۔آخرت اور ہمیشہ کی زندگی کیا دیتی ہے وہ ہمارے اعمال پر انحصار ہے۔ وہاں بیٹھا ہر ذی روح اس معصوم کی معصومیت کا تذکرہ کر رہا تھا۔ پھر آواز آئی ''نمازِ عشاء کا وقت ہوا چاہتا ہے سب لوگ مسجد میں پہنچ جائیں۔ مئوذن نے اذان دینا شروع کی۔ پھر 9 بجے نماز ادا کی گئی۔ باجماعت نماز کے بعد امام نے نمازِ جنازہ کا جائے وقوعہ بتایا۔اور نماز مکمل کرنے کے بعد جنازے کو کندھا دیتے گلیوں سے گزار رہے تھے۔ ہر ایک کی زبان پر کلمۂ شہادت تھا۔سب مل کر باری باری جنازے کو کندھا دے رہے تھے۔ دو تین گلیاں کراس کرنے کے بعد ہم اس جگہ پہنچے جہاں نمازِ جنازہ ادا ہونا تھا۔امام نے طریقۂ نمازِ جنازہ بتایا اور پھر سب قطاروں میں ترتیب ہو گئے۔اور سب نے ملکر نمازِ جنازہ ادا کیا۔

نماز کے بعد ہر ایک چاہ رہا تھا کہ اس معصوم کو آخری مرتبہ دیکھ لوں۔ یہی غرض لیے سب آگے کی طرف بڑھے۔لوگوں کی بے ترتیبی دیکھ کر امام نے کہا کہ قطار میں آؤ اور چلتے ہوئے دیکھ کر دوسروں کو بھی دیکھنے کا موقع دو۔ جب میری باری آئی تو میں نے اپنے دوست جہانزیب کو جی بھر کر دیکھا۔ میری آنکھیں رونے لگیں۔ دل پاش پاش ہوا جا رہا تھا۔ایک مرتبہ دیکھنے کے بعد دل میں آواز آئی دوبارہ دیکھ لے پھر زندگی بھر اسے نہیں دیکھ سکے گا۔ یہی سوچ لیے میں دوبارہ اس کی طرف لپکا اور پہلے کی نسبت اب کی بار میں کافی دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر اسے دوبارہ کندھے پر اٹھا کر قبرستان کی طرف لے جایا گیا۔ جو بندے کی آخری منزل ہے۔ میں نے چارپائی کے ایک حصے کو سہارا دیا ہوا تھا۔قبروں کے ایک طرف ہوتے ہوئے ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں زمین پر کھدائی کی ہوئی تھی۔غور سے دیکھا تو یہ میرے یار کی قیامت تک کی رہائش گاہ تھی۔ ہم نے جنازہ قبر کے عین قریب رکھا۔اور پھر اس کے چہرے سے پردہ اٹھایا گیا۔سب نے ایک مرتبہ پھر اسکا چہرہ دیکھا۔

میں اس کے چمکتے چہرے کو آنکھوں سے گزار کر دل میں اتار رہا تھا۔اس کا چہرہ اس قدر چمک رہا تھا کہ جیسے خدا کی قدرت اس معصوم پر مہربان ہو۔میری نظر اس کے چہرے پے تھی اتنے میں اس کے چہرے پر کسی نے ہاتھ رکھا اور بائیں گال پر پیار کیا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ اس نازک کے والد صاحب تھے۔سب نے اسے سمبھالا اور پھر اسے سپردِ خاک کیا گیا۔تلاوت کے بعد آخر میں دعا مانگنے کے بعد سب اپنے اپنے گھر روانہ ہونے لگے۔اس وقت میں نے سوچا کیا یہاں تک ہم لوگوں کا ساتھ تھا؟ دوست، احباب، رشتے دار اور والدین جنکا بندے کو مان ہوتا ہے۔اور جو ہر حال میں اپنی اولاد کا ساتھ دیتے ہیں۔ وہ بھی اسے اس اندھیری قبر میں تنہا چھوڑ کر جا رہے تھے۔ یہی تو حقیقت ہے کہ جب بندہ اس فانی دنیا کو چھوڑتا ہے تو جیسے تنہا آیا تھا ویسے تنہا ہی جاتا ہے۔ جاتے ہوئے جو چیز اس کے ہمراہ ہوتی ہے وہ اسکے اس دنیا میں کیے اعمال ہوتے ہیں۔ جنکے کرنے کے لیے اسے شکل دی گئی، اسکا وجود بنایا گیا اور جسکے لیے اسے اس دنیا میں نائب بنا کر بھیجا گیا۔

دوستو ہمیں بھی اسی کو ساتھی بنانا چاہیئے جو ہمارے جانے کے بعد بھی ہمارے ساتھ رہتا ہے۔اور اگر یہ ساتھی اچھا ہو تو آخرت بھی اچھی ہو جائے گی۔اس لیے ہمیں اعمال کی فکر کرنی چاہیئے۔اور ہر پڑھنے والے سے التماس کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ سورۃ فاتحہ، تین مرتبہ سورۃ اخلاص اور اول و آخر درود شریف پڑھ کر جہانزیب کے لئے دعا مانگے۔ شکریہ

طنز و مزاح

بچے

حسن سرفراز
11-IE

اوروں کی طرح ہمارا بچپن بھی بڑا معصوم تھا۔ بخدا کبھی کسی کے گھر یا دکان میں ڈاکہ نہیں ڈالا۔ نہ کبھی کسی فراڈ کیس میں ملوث ہو کر اپنی اور خاندان کی عزت کو خاک میں ملایا۔ یہاں تک کہ کبھی چرس اور بھنگ پیتے ہوئے بھی نہیں پکڑے گئے۔ ایک یہ ہمارا بچپن تھا کہ اب یاد آتا ہے تو ہم اپنی پاکبازی اور شرافت کو یاد کرتے ہوئے اپنے ہاتھ چوم لیتے ہیں اور ایک یہ اس دور کے بچوں کا بچپن ہے کہ

جو کروں اگر بتکدے میں بیاں تو کہے صنم بھی ہری ہری

یہ بتایئے کیا آپ کو کبھی کسی کلی سے واسطہ پڑا؟ میرا مطلب ہے کسی گناہوں سے پاک معصوم بچے سے؟

اگر آپ نے کہا ہاں! تو یقیناً آپ نے بھی میرا نقطہ اسی طرح پالیا تھا جس طرح ارشمیدس نے بھی اپنی ذہانت سے کچھ پالیا تھا۔ جی ہاں! میں یہی تو کہنا چاہ رہا تھا کہ اس عہد کے چالاک، بے باک بچوں کے مزاج کو سمجھنا، ان کے حسبِ حال مناسب رویہ اپنانا اور انہیں اس خوبی سے چمکارنا، پچکارنا کہ ہینگ لگے نہ پھٹکڑی، رنگ بھی چوکھا آوے۔۔۔ یہی سب سے مشکل کام ہے۔ سائنس دانوں نے ہتھیلی پر سرسوں جمانے کے طریقے پر اپنے اپنے نظریے ضرور دیے ہوں گے لیکن بچوں سے کیونکر نبٹا جائے۔ اس حوالے سے کسی سائنس دان کا کوئی مضمون، کوئی مقالہ آپ کی نظروں سے کبھی گزرا؟ سچ تو یہ ہے کہ اس ضمن میں سائنس دان بھی بے بس ہیں۔

ہوتا یہ ہے کہ آپ اپنے دور کے کسی انکل یا پیارے ماموں جان سے ملاقات کے لئے تشریف لے جاتے ہیں۔ اور ان کے صاحبزادے کو ایک کونے میں گم صم، چپ چاپ کھڑا دیکھتے ہیں کہ نہ حرکت کوئی نہ شرارت کوئی۔۔ آپ کے دل میں خیال گزرتا ہے کہ صاحبزادہ شاید میرے رعب میں آ گیا ہے۔ اس پر سے اپنی شخصیت کا سحر اتارنا چاہیے۔ ایک بچہ! اور یوں تہذیب کے دائرے میں بے حس و حرکت کھڑا ہو!!! یہ شرارتیں کیوں نہیں کرتا۔ میٹھی میٹھی شرارتیں کہ جن سے جی خوش ہو۔ بس یہی سوچ کر آپ اس کے والد بزرگوار سے اس کی تعریف کر دیتے ہیں۔ مثلاً آپ کا بچہ بہت خوبصورت ہے۔ بہت باادب ہے۔ دیکھئے تو لیاقت اور ذہانت کہاں کہاں سے ٹپک رہی ہے۔ ماشاءاللہ ماشاءاللہ

دوسری غلطی آپ سے یہ سرزد ہوتی ہے کہ اس کے بعد اسے اپنے پاس بلا کر گود میں بٹھاتے ہیں۔ اور پھر مانوس کرنے کے لئے یونہی پیارے ببلو کہنے کی غلطی بھی کر بیٹھتے ہیں۔ بس جناب اب جو فرقتوں کے فاصلے ختم ہوتے ہیں تو بتدریج پہلے آپ کی ٹوپی اڑتی ہوئی اوپر پنکھے میں جا اٹکتی ہے جس سے آپ کی زلفیں سخت پریشان ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد عینک ناک سے اتر کر فرش پر جا پڑتی ہے۔ پھر کچھ ایسا منظر دیکھنے کو ملتا ہے کہ ببلو میاں رواداری میں آپ کے سر اقدس پر بیٹھے طبلہ نوازی کر رہے ہوتے ہیں اور آپ بے بسی اور بے چارگی کی تصویر بنے انتہائی دردناک آواز میں یا اللہ رحم یا اللہ رحم پکار رہے ہوتے ہیں۔

ستم یہ کہ اس دوران آپ کے پیارے انکل برابر اپنے ببلو کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ ہاں جی! آپ نے درست پہچانا۔ ہمارا کامران بہت اچھا بچہ ہے۔ ایک دم ہشاش بشاش۔ بہت باادب ہے۔ کبھی مجھے یا اپنی ماں کو تنگ نہیں کرتا۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ کبھی مہمانوں سے بدتمیزی نہیں کرتا۔ ہم خود بھی حیران ہوتے ہیں کہ یہ آداب آخر اس نے کہاں سے سیکھے؟ مزید یہ کہ اپنی کلاس میں ہمیشہ پوزیشن لیتا ہے۔ جناب! میں اتنی اچھی تربیت کا سارا کمال اس کی والدہ کا سمجھتا ہوں۔ وگرنہ میں کیا کر سکتا ہوں؟ نرا بے صلاحیت ہوں۔

عقل مند کی پہچان غصہ کے وقت ہوتی ہے (سقراط)

اس پر (اگر ببلو آپ کو بولنے کا موقع دے تو) فقط یہ کہ پاتے ہیں۔ ہاں جی اس میں کیا شک ہے!

ہاں دوستو! بولو ایسا ہوتا ہے کہ نہیں؟ یہ سچ نہیں ہے کیا؟ ہم نے بھی تو اپنا تجربہ لکھا ہے، یونہی بے پر کی نہیں اڑائی۔ اور ایک دفعہ تو یوں ہوا کہ راہ چلتے میں ہم نے ایک بچے کے سر پر یونہی اپنا دستِ شفقت رکھ دیا۔ وہ تو ایسا کھلا گویا برسوں کا یارانہ ہو۔ کہنے لگا: بہت افسوس ہے بھائی جان! خالی سر پر ہاتھ پھیر کر بھاگ جاتے ہیں۔ بھئی آئس کریم وغیرہ کھلایئے تو بات بنے۔ دیکھئے میں یتیم بھی ہوں۔ آپ کو مفت میں ثواب ملے گا۔

بہتیرا سمجھایا کہ دیکھو برخوردار! ہم نے ایسا ثواب کی نیت سے قطعاً نہیں کیا تھا۔ لیکن نقار کھانے میں طوطی کی آواز سنے کون؟ ناچار آئس کریم کھلائی تبھی جان چھوٹی۔ آج کے دور کے بچے گو بے ادب، نا ہنجار سہی لیکن ایک بات ان میں اچھی بھی ہے۔ وہ یہ کہ اپنے پرائے کی، امیر غریب کی تمیز روا نہیں رکھتے۔ سب سے ایک سا سلوک کرتے ہیں۔ اور تو اور بڑے بڑے ادیبوں شاعروں کو بھی اپنے سامنے ذرۂ ناچیز سمجھتے ہیں۔ لیکن ایسے قصے اگلے وقت میں کبھی کبھار سامنے آجاتے تھے۔ جیسے ایک شاعر نے ایسی ہی کیفیات سے دوچار ہونے کے بعد کہا تھا۔

نہ بڑھاؤ بچوں سے ملت زیادہ
مبادا کہ ہو جائے ذلت زیادہ

ویسے یہ شعر بہت عبرت انگیز اور پر اثر ہے۔ کسی بھی بچے سے راہ و رسم بڑھانے سے پہلے اس کا دہرانا سودمند ثابت ہوگا۔

چونکہ بچوں کی ذہنیت کو سمجھنا کچھ آسان نہیں۔ لہٰذا عقل مند لوگ اول تو بچوں سے تعلق زیادہ بڑھاتے ہی نہیں۔ بڑھاتے بھی ہیں تو بچوں کی نفسیات میں ایم۔اے کرنے کے بعد۔ فائدہ اس کا یہ ہے کہ انسان ذلیل ہونے سے پہلے بچ نکلتا ہے۔ سنا ہے اگلے وقتوں میں بچے بہت سعادت مند ہوتے تھے، بلکہ سنا کیا ہے، ہماری اپنی مثال سامنے ہے۔ ہم بھی اپنے ابا سے بہت ڈرا کرتے تھے۔ ان کے سامنے زیادہ اول فول بکنے سے گریز کرتے تھے۔ مائیں بھی روتے بچوں کو ''رونا بند کرنا بکار! نہیں تو بلاتی ہوں ابھی تیرے ابا کو'' کہہ کر چپ کرا لیتی تھیں۔ لیکن جوں جوں زمانہ بدلا ''تغیر اک ثبات کو ہے زمانے میں کے بموجب ''ابا حضور'' پاپا اور ڈیڈی ہو گئے۔ اور اب تو اکثر ''ممیاں'' اپنے روتے ہوئے لختِ ہائے جگر کو یوں چپ کراتی ہیں ''خاموش ہو جاؤ مائی کِڈ! نہیں تو وہ دیکھو۔۔ وہ آرہا ہے جن بابا!'' اس ناروا تبدیلی کا اندازہ ہمیں اپنے ایک نئے پڑوسی سے پہلی ملاقات میں ہوا۔ ہم ان کے ڈرائینگ روم میں بیٹھے تھے۔ وہ اندر سے چائے لے کر آئے تو ساتھ اپنے پیارے بیٹے کو بھی لیتے آئے۔ ''جناب یہ ہے میرا بیٹا شایان احمد! چلو بیٹا بھائی جان سے ہاتھ ملاؤ۔۔ شامالیکم کرو'' انہوں نے صاحبزادے کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ چناچہ شایان بیٹے نے ہم سے شامالیکم کیا لیکن اس کے بعد دفعتاً اپنے چھپے جوہر ظاہر کرنے لگے۔ یوں کے ایک ہی جست میں ایک صوفے سے دوسرے صوفے پر جا پہنچے۔ اگلے ہی لمحے اپنے بابا کے کاندھوں پر براجمان ہو گئے۔ اور پھر چشم زدن میں میز پر آ ٹپکے۔ ان کے اباجی بہت تلملائے۔ پہلے تو بہتیرا پیار سے سمجھاتے رہے ''اونہوں بیٹا! غلط بات! دیکھو بھائی جان کیا سوچتے ہوں گے؟'' لیکن بیٹے پر اس کا چنداں اثر نہ ہوا۔ بدستور اودھم مچاتے رہے۔ ان کی یہ بدتمیزی آخر کب تک برداشت کی جا سکتی تھی۔ چناچہ اب جو ہمارے پڑوسی کا پارہ چڑھا تو گرج کر بولے ''شایان! میں کہتا ہوں آرام سے بیٹھ جاؤ۔ نہیں تو ٹھہرو! ابھی بتاتا ہوں تمہاری امی کو۔۔''

سچ تو یہ ہے دوستو! ان کی اس دھمکی پر ہم بھی کانپ کر رہ گئے۔

جو کسی قوم سے مشابہت پیدا کرتا ہے وہ اس میں سے ہے (حدیثِ نبوی ﷺ)

احسن عباسی
12-EE

جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

آپ نے اکثر ٹرکوں، ویگنوں، بسوں کے پیچھے دلچسپ اور عجیب وغریب شعروشاعری اور فقرات دیکھے ہونگے۔ان کا ایک منفرد اور جداگانہ انداز ہوتا ہے۔اس قسم کی شعروشاعری میں قافیہ اور ردیف کی کوئی قید نہیں ہوتی۔بس مطلب سمجھ میں آنا چاہیے۔اسی طرح اردو بھی عجیب وغریب ہوتی ہے۔مثلاً 'ماں کی دعا جنت کی ہوا'۔'ہارن دیں راستہ لیں'۔ایک ویگن کے پیچھے لکھا تھا 'میں بھر کے چلا جاؤں گا،تو دیکھتا رہ جائے گا' لو بتاؤ دوسرا ڈرائیور کیا کرے؟؟ایک کوچ نے مجھے تیز رفتاری سے اوورٹیک کیا، پیچھے لکھا تھا غصہ نہ کر یار،ٹیم ساڈی مجبوری اے۔ایک منی بس میرے پیچھے آئی انجن سے ایسی دردناک آوازیں آرہی تھیں کہ میں ڈر کر ایک طرف ہوگیا پیچھے الفاظ درج تھے پومستری کی دہشت۔جو میرا منہ چڑا رہے تھے۔ایک کھٹارا بس ٹوپی سے غازی کے درمیان چلتی ہے اسکی حالت ایسی ہے کی آپ کو یقین نہیں ہوتا کہ آپ منزل مقصود پر پہنچیں گے، بلکہ مجھے تو گمان بھی نہ تھا۔ڈرائیور کی سیٹ کے اوپر رقم تھا۔

نہ انجن کی خوبی نہ کمال ڈرائیور چلی جارہی ہے خدا کے سہارے

دو زبوں حال رکشے ساتھ ساتھ چلے جارہے تھے۔اتنا دھواں کہ اللہ کی پناہ رکشے کے پیچھے تحریر تھا روپ کا راجہ دوسرے ڈرائیور نے لکھوا رکھا تھا

'''پاکستانی دلیپ کمار''

ایک بہت ہی سجی سجائی، بنی سنوری سوزوکی پر لکھا تھا،'سپنوں کی ملکہ'ایک صاحب میرے ساتھ بیٹھے تھے،انہوں نے یہ پڑھا اور ٹھنڈی سانس لی میں نے کہا'صاحب خیریت تو ہے'؟ کہنے لگے بڑے عرصے سے سوزوکی لینے کی سوچ رہا ہوں، پیسے جمع نہیں ہوتے میرے لیے واقعی سپنوں کی ملکہ ہے۔ایک رکشے والے نے مجھے 'سائیڈ' ماری، گرتے گرتے بچا۔نظر ڈالی تو رقم تھا۔'بہت یاد آؤں گا'۔واقعی پندرہ دن تک یاد آتا رہا۔اکثر ٹریکٹر والے full volume میں Tape Recorder لگا کر گزر جاتے ہیں۔پیچھے تحریر ہوتا ہے 'گونگا ساہیوال دا'۔

آج کل نمبر ایک کی دوڑ ہے۔ہر کوئی کہتا ہے کہ 'میں نمبر ایک ہوں' پہلے مادھوری نمبر ایک ہے آج کل قطرینہ کا راج ہے۔لیاری میں گدھا گاڑی والا تھا اس نے گدھے پر مہندی سے لکھوا رکھا تھا 'نمبر ایک'۔اکثر گاڑیوں کے عقب میں درج ہوتا ہے 'ابھی تو میں جوان ہوں'۔'پردیسی بالم' یا 'بے وفا صنم'۔ایک خوبصورت کوچ کا نیشنل ہائی وے پر حادثہ ہوگیا۔پیچھے لکھا تھا 'سجیلی جوانی'

جس ٹرک سے ٹکر ہوئی وہ بھی پاس ہی کھڑا تھا اس پر لکھا تھا 'مے درد زمانہ کیا جانے'

ایک ٹھیلے والے نے ایک سائیکل پر پوری دُکان سجا رکھی تھی۔بڑی خوبصورت دُکان تھی۔چنے کھانے میں بہت مزیدار تھے۔مرچیں بہت تیز تھیں۔میرا منہ جلنے لگا۔لیکن دل اور کھانے کو چاہ رہا تھا۔اچانک سامنے جاتے ہوئے ایک رکشے پر نظر پڑی لکھا تھا 'دل تو پاگل ہے'۔بچپن سے اب تک بسوں اور دیگر گاڑیوں کے ادب سے مستفید ہونے کے بعد میں اتنا تجربہ کار ہوگیا ہوں کہ عید کی چھٹیوں میں اسلام آباد جانے والی UET کی بس میں لڑکیوں اور سامان کے درمیان پھنسے لڑکوں کی قسمت دیکھ کر سوچتا ہوں اسکے پیچھے تحریر ہونا چاہیے:

'دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا'

نہ تمہاری محبت حد سے زیادہ ہو نہ تمہاری نفرت (حضرت عمرؓ)

ملکۂ لباس

حافظ قاسم علی
10-EE-70

جب تک خود نہیں پہنی تھی اس کے فوائد کا قطعی علم نہیں تھا۔لیکن جب کسی سے سنا کہ یہ وہ نادر لباس ہے کہ جتنا گھستا ہے اتنا ہی قیمتی ہوتا جاتا ہے تو سوچا کیوں نہ میں بھی آزما کے دیکھوں لیکن پھر بھی ایک جھجک مانع تھی۔بلآخر یار لوگوں کے پرزور اسرار پر اس کو پہننے کا تہیہ تو کر لیا لیکن اب ایک اور مسئلہ درپیش تھا۔مسئلہ یہ تھا کہ اپنی جیب مزید اخراجات کی اجازت نہ دیتی تھی۔اس کا بھی ایک خوبصورت حل دوستوں نے ہی نکالا۔

یار لوگ فرسٹ کلاس،سیکنڈ ہینڈ،امپورٹڈ کپڑوں کی دکان پر لے گئے۔استفسار پر جب یہ راز افشا ہوا کہ وہ خود بھی عرصۂ دراز سے یہیں سے استفادہ کر رہے ہیں تو ان کی ذہانت کا قائل ہونا پڑا۔دکان کو دیکھ کر احساس ہوا کہ دوست واقعی کسی سٹینڈرڈ کی دکان پر لائے ہیں۔ہر طرف امپورٹڈ اشیاء نظر آ رہی تھیں۔آخر کار میں نے ایک اعلیٰ قسم کی جینز پسند کر لی۔

دوسرے دن ہم جینز چڑھائے،مستانہ چال چلتے ہوئے باہر نکلے تو ہر کسی کی نگاہ کا مرکز تھے۔سارا دن لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے رہے تاکہ لوگوں پر ہماری خوش لباسی کی دھاک بیٹھ جائے۔

کچھ ہی دن کے بعد ہم کو احساس ہوا کہ جینز جیسی نعمت پا کر ہمیں بہت سے ملبوساتی جھنجھٹوں سے نجات مل گئی ہے۔رات کو جینز ہی پہن کر سو گئے۔صبح اٹھ کر اگر منہ دھونے کا ٹائم ملا تو دھو لیا ورنہ شیروں کے منہ تو دھلے ہی ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ نہ کریز کا مسئلہ نہ شدید سردی میں کپڑے تبدیل کرنے کا جھنجھٹ۔جینز کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اسے ہر عمر اور ہر قد کے طلباء آسانی سے پہن سکتے ہیں۔اگر لمبی ہو تو پائنچے فولڈ کر لیجئے،یہ بھی ایک فیشن ہے۔اگر سال کے آخر میں ایک دفعہ دھونے سے اس کا رنگ پھیکا پڑ جائے اور جگہ جگہ سے بدرنگی ہو جائے تو بھی پہننے والا مہذب اور فیشن ایبل نظر آتا ہے۔چائے،سالن،سیاہی اور موٹر سائیکل کی گریس کے جتنے دھبے بڑھتے جائیں گے اس کا حسن بھی دوبالا ہوتا جائے گا۔

یہ بے حد کم خرچ اور بالانشین ہے۔اگر مسلسل پہننے سے اس کے گھٹنے گھس جائیں تو پچھلی جیبیں کٹوا کر گھٹنوں کی جگہ لگوائی جا سکتی ہیں۔ویسے پھٹے گھٹنوں والی جینز کا فیشن عام ہے۔جینز جتنی تنگ ہوگی آپ اتنے ہی سمارٹ نظر آئیں گے اور جتنی کھلی ہوگی اتنا ہی آپ کے عیب چھپائے گی جیسے پتلی پتلی ٹانگیں۔

اس کے علاوہ نہ اس میں بٹن ٹوٹنے کا ڈر نہ ہی ادھڑنے کا اندیشہ اور اگر بالفرض کہیں سے پھٹ بھی جائے تو "I Love U" کا سٹیکر لگا لیں۔اور اگر بہت زیادہ پھٹنا شروع ہو جائے تو ایک سٹیکر بے وفا کا بھی لگا لیں اور اگر حالت زیادہ خراب ہو جائے تو سامنے لٹکا کر بندوق سے کارتوس فائر کریں اور پھر پہن لیں۔یقین مانیں کہ یہ بھی ایک فیشن ہے۔

اگر جینز کے پائنچے خراب ہونے لگیں تو دھاگے باہر نکال لیں۔اس طرح ایک جھالر بن جائے گی جس سے آپ کی گریس بڑھے گی۔اب اگر حالت خراب ہو جائے یا آپ کا دل بھر جائے تو بھی اس کو پھینکئے گا مت۔کیونکہ اب بھی اس سے کئی قسم کے بیش قیمت لیڈیز بیگ یا سبزی کے تھیلے بنائے جا سکتے ہیں۔اگر اور کچھ نہ سہی تو اس کو کم از کم گیلا کر کے فرش پر ضرور پھیرا جا سکتا ہے۔

بے شک کوئی ایسا لباس نہیں جو جینز کا مقابلہ کر سکے۔اس کو بلا شک وشبہ ''ملکۂ لباس'' قرار دیا جا سکتا ہے۔لیکن کچھ قدر ناشناس لوگ اس کی قدر نہیں کرتے۔

انصاف میں تاخیر انصاف سے انکار کے مترادف ہے (گلیڈ سٹون)

قلم کی حرمت

سمیرا رفاقت
لائبریرین

پرندے کے پر کو قلم کے لیے استعمال کرنے والے نے یہ کبھی نہ سوچا ہوگا کہ جب یہ پَر کا قلم ترقی کرتے کرتے ہیرو، ڈالر، ایگل قلم اور بہترین قسم کے بال پوائنٹ کی شکل اختیار کر جائے گا تو یہ صرف لکھنے کے لیے استعمال نہیں ہوگا بلکہ شلوار میں ازار بند ڈالنے کیلئے، کان کی خارش ختم کرنے کے لیے، دانتوں میں خلال کرنے کے لیے، بوقت ضرورت گلاس میں چینی یا گلوکوز حل کرنے کے لیے بھی اس جدید عہد میں قلم ہی استعمال ہوگا۔ اور ایک اَن پڑھ آدمی کا اپنی جیب سے قلم لگانا ایک فیشن بن جائے گا۔

لفظ حقیقتوں کا لباس ہوتا ہے۔ قلم کا لفظ سے اور لفظ کا قلم سے اور ان دونوں کا زبان سے گہرا تعلق ہے۔ لفظ زندگی کو خاموشی سے نکالتا ہے۔ عقلی راستے کھولتا ہے اور اس میں قلم کا کردار نمایاں ہوتا ہے۔ انسان علم کے بغیر حیوان جیسا ہے اور علم قلم کے ذریعے سیکھا اور سکھایا جاتا ہے۔ بغیر قلم کے آدمی بہت کچھ سیکھنے کے باوجود بھی بہت کچھ نہیں سیکھ سکتا۔ علم سیکھنے اور سکھانے کے لیے قلم کا ہونا لازم ہے۔

آسمانی کتابیں، ادب، تاریخ، سائنس، فلسفہ، حکمت وغیرہ سارے علوم قلم ہی کی وجہ سے ہم تک پہنچے ہیں اور قلم ہی کی وجہ سے آنے والے زمانوں کے لیئے محفوظ ہیں۔ لفظ لوح محفوظ پر آنے کیلئے قلم ہی مرہونِ منت ہے۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ واقعی لفظ قلم کا مرہونِ منت ہے تو پھر ہمارے جذبات احساسات اور ہماری زندگی کے سارے معاملات قلم کے مرہونِ منت ہیں۔ تو ہم بھی قلم کے احسان مند ہوئے۔ آدمی جسکا احسان مند ہوتا ہے اُس سے کبھی غلط کام نہیں لیتا۔ قلم سے شلوار میں ازار بند ڈالنا، شریف افسر کو رشوت لینے پر مجبور کرنے کے برابر ہے۔ میں تو کھلے الفاظ میں کہتی ہوں کہ اگر رشوت لینے اور دینے والا جنت میں نہیں جائے گا تو قلم سے کان کی خارش مٹانے والا بھی جنت میں نہیں جائے گا۔ صدیوں پہلے جو کام قلم سے لیا جاتا تھا اب اس جدید عہد میں کمپیوٹر کے کی بورڈ (key board) سے لیا جاتا ہے۔ کتب رسائل، اخبارات حتیٰ کہ درخواست فارم اور سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں اسٹام وغیرہ بھی کمپیوٹر کے کی بورڈ (key board) اور پرنٹر (printer) کے محتاج ہیں۔

کیا قلم صرف اسٹام پیپر، درخواستوں اور دیگر ضروری کاغذات پر دستخط کرنے کے لیے ہی رہ گیا یا پھر اہل قلم کے ہاتھ میں۔۔۔۔۔؟

"غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہیں (حضرت علیؓ)

میڈان چائنہ

ناصر علی مغل
11-SE-40

پاکستان کے شمال مشرق میں ایک بستی ہوا کرتی تھی۔اوہ شاید فقرہ غلط ہے کیونکہ پاکستان بعد کی بات ہے اور وہ بستی پہلے کی بات ہے۔ایک بستی کے شمال؟ یہ بہت بڑا معمہ ہے۔بچپن سے لے کر اب تک ٹیچرز نے پاکستان کا جغرافیہ تو پڑھا دیا مگر یہ بات آج تک نہ بتائی کہ باقی ممالک کو پاکستان کہاں پڑتا ہے۔قصہ مختصر، پاکستان کے مشرق میں ایک بستی ہوا کرتی تھی، جہاں کے لوگوں کی آنکھیں محبوبہ کے گھر کے دروازے کی طرف بندھی نظر آتی تھیں۔جنہوں نے شاید کبھی کوشش ہی نہیں کی کہ ہم بھی آنکھیں کھولیں۔علامہ اقبال نے فرمایا:

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ

یہ مصرعہ جات صرف برصغیر تک ہی محدود رہ گئے۔شاید انہوں نے سنے نہیں اگر سنے تو سمجھے نہیں۔خیر ہم کہاں تھے کہ پاکستان کے مشرق میں ایک بستی تھی، جسے چین کے نام سے جانا جاتا تھا۔اب بھی اسی نام سے جانا جاتا ہے۔اسے انگریزی میں "چائنہ" کہتے ہیں۔مگر پاکستان میں یہ لفظ اتنا بدنام ہوا کہ یہ انگلش کی بجائے "پینڈو" زبان کا لفظ لگنے لگا۔

پاکستان میں جس چیز کے اوپر کچھ نہ لکھا ہو کہ کہاں کی ہے، سمجھ جائیں کہ یہ میڈان چائنہ ہے۔ہاں مگر انسانوں پر بھی اس کے بہت اثرات ہیں۔میڈان چائنہ کو پہچاننا مشکل نہیں ہے۔اگر گرل فرینڈ دوسرے دن قطعہ تعلق کر جائے تو سمجھ جائیں کے میڈان چائنہ ہے۔آپ کو ہر دوسری چیز پر میڈان چائنہ لکھا ہوا ملے گا۔میں بہت حیران ہوا جب میں نے کچھ چیزوں پر میڈان پاکستان لکھا ہوا دیکھا۔ان اشیاء میں بالوں والی کنگھی، سرمہ دانی، صفائی والا برش، صابن دانیو غیرہ جیسی چیزیں شامل ہیں۔

ویسے کیا یہ کھلا تضاد نہیں کہ ہر جگہ چائنہ کی چیز استعمال کی جاتی ہے مگر جب میرا دوست چائنہ کی ڈگری لے کر انٹرویو کے لیے گیا تو یہ طعنہ سننے کو ملا کہ تمہاری ڈگری چائنہ کی ہے۔اب انہیں کون بتائے کہ "ڈگری ڈگری ہوتی ہے، جعلی ہو یا چائنہ کی"۔

چائنہ کی چیزیں بنانا بہت مشکل کا کام ہے۔مگر اس سے پہلے آپ کو چائنیز بنانا آنا چاہئے۔اس چائنیز سے مراد چائنیز آدمی ہے۔اسکی ریسپی درجہ ذیل ہے۔

سب سے پہلے ایک غبارہ لیں، اس میں آدھے سے زیادہ ہوا بھریں۔جب ہوا بھر جائے تو اس کے منہ پر دھاگے کی جگہ اسی غبارے کے باقی حصے سے گانٹھ باندھ دیں (سستا کام)۔غبارہ بھی چاہے گھٹیا کوالٹی کا ہو، یا سپیلی چائنہ کا ہو۔اسکے بعد کاغذ سے اسکی بازو سر ٹانگیں بنائیں۔اسے تھوک سے غبارے کے ساتھ چپکا دیں۔یہ گارنٹیڈ بات ہے کہ یہ غبارہ نماء انسان کھڑا نہیں ہو سکے گا۔آخر چائنہ کا ہے۔پھر ملتانی مٹی سے اسکا منہ بنائیں۔پھر آنکھیں، آنکھیں بے شک رہنے دیں۔وہ ویسے بھی نہیں کھلیں گی۔اگر آنکھیں کھولنا مطلوب ہو تو پھاڑ دیں غبارے کو۔اس سے پہلے گن کر تین دھاگے کالے رنگ کے اسکے سر پر بالوں کی جگہ لگائیں۔پھر اسکو دور سے دیکھیں، اگر آپکو کہیں سے یہ محسوس ہو کہ یہ آپکی تخلیق نہیں ہے تو مبارک ہو آپ نے چائنیز بنا لیا۔

میڈان چائنہ اشیاء بنانا ایسا ہی ہے جیسے کسی کو اُلو بنانا۔اور واقعی ایسا ہی ہے۔کتنا عجیب لگے کہ آپ شادی کر کے دلہن لائیں اور اس کے ساتھ میڈان چائنہ کا ٹیگ لگا ہو۔اور کتنا مزہ آئے کہ ساتھ "واپسی نہیں" بھی لکھا ہو۔ پاکستان کا میڈان چائنہ کے ساتھ "عینک اور آنکھوں" والا رشتہ ہے۔ہمارے لیڈر میڈان چائنہ، ہمارا آئین میڈان چائنہ، ہمارے قانون میڈان چائنہ، ہمارے ارادے میڈان چائنہ۔تقریباً سب کچھ۔مگر شکر ہے کہ یہ پاکستان ہی ہے، چلیں نام کا ہی سہی۔

جنگ جنگلیوں کی تجارت ہے (نپولین)

چائنہ چائنہ کردی نی میں آپے چائنہ ہوئی

پچھلے دنوں میاں صاحب نے کہا گوادر پورٹ چائنہ کے حوالے کرنا ٹھیک نہیں ہے۔شاید انکا چائنہ کی اشیاء سے ہی پالا پڑا ہے۔ بلکہ ان کے ارادے، بیانات میڈان چائنہ ہیں۔ یا وہ ہماری اوپر والی ریسپی سے چائنیز بناتے رہے ہیں اور ان سے ٹھیک بن نہیں پایا۔

ایک بار میں نے ایک ایسی چیز پر میڈان چائنہ لکھا ہوا دیکھا کہ میرا دل کیا کہ میں کسی کی ٹنڈ پر چڑھ کر گھیسیاں کروں، کیلا کھا جاؤں، یا سپر مین بن کر انڈر ویر پہن کر سپائیڈر مین کی طرح چھلانگیں لگاؤں۔اور وہ چیز فلش صاف کرنے والا تیزاب تھا۔میڈان چائنہ اشیاء استعمال کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ انڈے سے فُٹ بال کھیل رہے ہوں۔ پاکستان میں چائنیز کا اثر ورسوخ دیکھ کر لگتا ہے کہ اردو میں بھی چائنیز گھُس آئے گی، جیسے۔

آسمان سے گرا چائنہ میں اٹکا

بھاگتے چور کی چائنہ کی لنگوٹی

بلی کو چائنہ کے خواب وغیرہ وغیرہ...

اسلام آباد میں اتنے زیادہ چائنیز کو دیکھ کر میرے اشعار الٹے پڑنے لگے محسوس ہوا کہ میری اردو سیمی چائنیز ہے۔جیسے،

الفاظ اتر آتے ہیں چائنیز کی صورت یا اٹھو میری دنیا کے چائنیز کو جگا دو اللہ معاف کرے غالب پر بھی چائنیز غالب آ گئی، شعر آمد ہوا،

چائنہ کس منہ سے جاؤ گے غالب

چائنیز تم کو مگر نہیں آتی

واللہ اعلم اب پاکستان میں کیا کیا میڈان چائنہ آتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ کل کو ہماری بلی کے بچے بھی میڈان چائنہ کی مہر کے ساتھ پیدا ہوں۔

اللہ پاکستان کے مستقبل کو "میڈان چائنہ" جیسی صورت حال سے بچائے، آمین۔

ولادت کی تکلیف اور نماز

سوال ۳۵ کیا میرے لئے ولادت کی تکلیف (دردزہ) میں نماز پڑھنا جائز ہے؟

جواب حیض یا نفاس سے پاکیزگی کی حالت میں عورت پر نماز پڑھنا واجب ہے۔ اگر عورت نے ولادت سے ایک آدھ دن پہلے خون دیکھا تو یہ خون نفاس کے تابع ہو گا' لہٰذا اس وجہ سے وہ نماز نہ پڑھے اور اگر خون نہیں آیا تو چاہے عورت ولادت کی تکلیف سے دوچار ہی کیوں نہ ہو اسے نماز پڑھنا ہو گی' بالکل اس مریض کی طرح جو بیماری کو محسوس کرتے ہوئے بھی نماز ادا کرتا ہے پس تو جب تک اس کی عقل باقی ہے اس سے نماز ساقط نہ ہو گی۔

---- شیخ ابن جبرین ----

پرانا تجربہ نئی تعمیر کی بنیاد ہوتا ہے (ملٹن)

ارسلان مغل
11-SE

UET سے المہندس تک

یہ UET ہے۔UET میں داخل ہونے سے پہلے اسکا گیٹ آتا ہے۔جسے گیٹ 1 کہتے ہیں۔اگر آپ گیٹ 1 سے داخل ہوں تو گیٹ 2 سے نکل بھی سکتے ہیں۔مگر گیٹ 1 سے گیٹ 2 کے درمیان ایک الگ دنیا بستی ہے۔گیٹ 1 کی سلاخیں کسی کے لئے تفریحی پارک کی سلاخیں ہیں تو کسی کے لئے جیل کی سلاخیں۔

UET میں قدم رکھتے ہی ایک الگ قسم کی بو آتی ہے کہ آپ بے اختیار ناک پر ہاتھ رکھ لیتے ہیں۔اسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ ساتھ میں عائشہ ھال ہے،اسکی وجہ ساتھ سے گزرنے والا نالہ ہے۔گیٹ کے بالکل سائیڈ پر FF ہاسٹل ہے۔FF کا مطلب تو پتا نہیں کہ فیملی رینڈ ہے یا فیملی فیکلٹی۔بس اس ہاسٹل میں یہ خاص بات ہے کہ یہاں AC لگے ہوئے ہیں۔

اس کے بالکل آگے ایک بڑی سی قلعہ نماء بلڈنگ ہے،جس کو دیکھتے ہی GHQ کا گمان ہوتا ہے۔یہ 12،12 فٹ دیواریں،اوپر لگی ہوئی خاردار تار۔UET کے باقی ہاسٹل کے مکین اسے جنت سمجھتے ہیں۔مگر حقیقتاً یہ احمقوں کی جنت،مطلب کہ وہ لوگ احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں جو اسے جنت سمجھتے ہیں۔اس کے اندر کی دنیا باہر کی دنیا سے مختلف ہے۔باہر رہنے والوں کو جتنا اس کے اندر جانے کا شوق ہوتا ہے،اتنا ہی اندر رہنے والوں کو باہر آنے کا ہوتا ہے۔اکثر اوقات کچھ دل جلے کبھی ساتھ والے پُل پر چڑھ کر یا کبھی اس کی دیواروں کے سوراخوں میں سے جھانکتے ہوئے اندر کا نظارہ ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔مگر انگور کھٹے ہیں کے مصداق ناکامی کا منہ ہی دیکھنا پڑتا ہے۔

اندر اس جگہ کے مکینوں کا حال تو فیض احمد فیض ہی بیان کرتے ہیں کہ؛

دشتِ تنہائی میں، اے جانِ جہاں لرزاں ہے

یہاں سے تھوڑا آگے جا کر پہلا ڈیپارٹمنٹ سافٹ ویئر ڈیپارٹمنٹ آتا ہے جہاں؛

گلوں میں رنگ بھرے ابرِ نو بہار چلے

اور اس کے آگے بلڈنگز کی لائن لگ جاتی ہے جسکے بالکل آخر میں ہم رہتے ہیں جو گیٹ 1 سے داخل تو ہو جاتے ہیں مگر راہگیروں کی طرح جلدی exit نہیں ہوتے۔

بس یہ اسی داخلے کے کچھ عرصہ بعد کی ہی بات ہے،جب میں نے نئی نئی موویز دیکھنی شروع کی تھیں۔اس دن بھی رات کو دیر تک مووی دیکھتا رہا اور سو گیا۔صبح عجیب سی کیفیت تھی شاید خواب دیکھ رہا تھا یا حقیقت تھی۔جلدی سے بھاگ کر کلاس کی طرف گیا۔جیسے ہی کلاس میں قدم رکھا ایک زوردار آواز نے قدم پکڑ لئے۔

You،آواز آئی۔

میں چونک گیا،شاید مجھے پکارہ گیا تھا۔

ناامید ہونے سے عمر گھٹتی ہے(ارسطو)

میں نے اپنے پیچھے دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے غور سے آگے دیکھا۔ وہاں ایک انتہائی نستعلیق قسم کی چیز کھڑی تھی۔ جس کے سر کے بال میاں صاحب کی طرح گھنے تھے (میاں محمد منشاء کی طرح)۔ اس چیز کو شاید میں نے کہیں دیکھا تھا۔ شاید spiderman کا ولن یا Dark night rises کو ولن۔ i am not sure. میں نے جلدی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

Yes You ، آپ لیٹ ہیں۔

Late شاید مرحوم کو کہتے ہیں۔

میں نے غور کیا مگر، " مرنے کے بعد کیا ہوگا" کی کوئی نشانی نظر نہیں آئی۔ ابھی بیٹھو اور آئندہ In Time کلاس میں موجود رہنا۔

یاد آیا کہ" In Time" تو پچھلے ہفتے ہی دیکھی تھی Cinepax میں۔ خیر ٹیچر نے پھر پڑھانا شروع کیا۔

یہ curve یہاں سے round turn ہوگی۔

پھر خیال آیا کہ wrong turn شاید horror مووی تھی۔

یہ سوال exam کے لحاظ سے بہت اہم ہے، سر کی آواز آئی۔

ہاں " Exam" مووی تو اچھی تھی مگر climax کچھ اسپیشل نہیں تھا۔

اور" Next " سوال کا جواب آپ دیں گے۔ اشارہ میری طرف تھا۔ اف یہ" Next " میں ہیرو "Nicolas cage" تھا یا " Tom Cruise" شاید "Nicolas cage" تھا۔

میں نے جلدی سے کہا سر "Nicolas cage"۔

سر نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں میری طرف دیکھا۔

مسٹر یو آر ناٹ سیریس ۔آواز آئی۔

"serious" کا سن کر مجھے " Dark Night " کا ولن یاد آ گیا۔

اور ان کی شکل مجھے " Dark Night " کے جوکر جیسی محسوس ہوئی، میری ہنسی نکل گئی۔ ٹیچر کا پارہ" Avatar Movie " کے نرنس کی طرح اوپر چڑھ گیا۔

غصے میں مجھے باہر نکلنے کا اشارہ ہوا۔

میں باہر نکلنے لگا، دروازے پر کھڑے ہو کر ایک حسرت بھری نگاہ ٹیچر کی طرف دوڑائی مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔

تیرے کوچے سے ظالم اس طرح جانا ہوا اپنا

چلے، چل کر رُکے، رک کر چلے، چل کر زرا ٹھرے

باہر نکل کر خیال آیا کہ میرا رجسٹر تو اندر رہ گیا ہے۔

کلاس میں داخل ہوا تو ٹیچر کی گرج سنائی دی ???What

میں نے کہا،

شاید مجھے نکال کے پچھتا رہے ہوں آپ

محفل میں اس خیال سے پھر آ گیا ہوں میں

تقدیر بہت کم تدبیر کا ساتھ دیتی ہے (فیثا غورث)

Pingles کی مونچھوں والے ٹیچر نے جب سلطان راحی والی آنکھیں دکھائیں تو میں جلدی سے رجسٹر اٹھا کر باہر نکل آیا۔

باہر نکلتے ہی ایک صنفِ نازک سے سامنا ہو گیا۔

آپ کلاس لے کر آ رہے ہیں؟؟؟ میں نے دانت نکالے، سر ہلا دیا۔

آپ نے لیکچر نوٹ کیا ہے؟؟؟

کسی دوشیزہ سے بار بار اتنی عزت سے "آپ آپ" سن کر مجھے اپنا آپ خاوند سا محسوس ہونے لگا۔اس سے پہلے کہ میں تخیل میں حد سے آگے بڑھتا، اس کی آواز آئی۔

بھائی آپ مجھے نوٹس دے دیں گے، اور میری حالت؛

چھن سے جو ٹوٹے کوئی سپنہ

جگ سُونا سُونا لاگے

جیسی ہو گئی۔

اور میں ایک لفظ منہ سے نکالے بغیر اپنی حالت درست کرنے کے لئے پانی پینے چلا گیا۔

اور UET کے واٹر کولرز سے پانی پینے کا طریقہ بھی الگ ہوتا ہے۔سب سے پہلے آپ ادھر ادھر دیکھیں۔لازماً وہاں گلاس موجود نہیں ہوگا۔اگر ہوگا تو شاید 10000 BC کا ہوگا۔پھر انتہائی مہذب انداز میں کولر کے سامنے کھڑے ہو جائیں۔اگر کوئی صنفِ مخالف گزر رہی ہو تو مسکرا کر اس کے گزرنے کا انتظار کریں۔جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہو جلدی سے کولر کے رائیٹ سائیڈ پر جھپٹنے کے انداز میں کھڑے ہو جائیں، اور انتہائی محتاط انداز میں ہاتھ بڑھا کر چلو بنا کر پانی پینا شروع کر دیں۔اس احتیاط کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کے کولر کی ٹوٹی سے چار جگہ سے پانی نکلتا ہے۔اور کچھ جلدی کریں تا کہ کوئی آپ کو یہ غیر مہذب کام کرتے دیکھ نہ لے۔

تو جناب میں نے انہی احتیاطوں کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے پانی پیا اور اپنا منہ جو اتنی بے عزتی کے بعد فِٹے منہ ہو چکا تھا اسے دھونے واش روم گیا۔UET کے نلوں کی بھی اپنی خاصیت ہے۔یہ واقع ہی انجینیئرنگ یونیورسٹی کے نل محسوس ہوتے ہیں کیونکہ خصوصاً ہاسٹل میں اگر اوپر سے نل کھولنے سے پانی نہ آئے تو نیچے سے اسکا وال کھولیں، پانی وافر مقدار میں برآمد ہوگا۔

تو جناب ایک اور بات جو یہاں نظر آئی کہ یہاں کا حال بھی بالکل پاکستان کی طرح ہے۔اکثر جگہ ایسا بندہ فِٹ کیا ہوتا ہے جو ٹوٹل unfit ہوتا ہے۔کچھ ایسا ہی میرے ساتھ بھی ہونے جا رہا تھا۔میری دماغی حالت کا تو آپ کو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا۔اب مجھے فلموں میں اتنا ایکٹو دیکھ کر کسی نے مشورہ دیا کہ المہندس جوائن کر لو۔سو میں بھی نکل کھڑا ہوا انٹرویو دینے۔میں کمرے میں داخل ہوا۔انٹرویو کوئی اس شعبے کے ایڈیٹر صاحب لے رہے تھے جنکا نام رانا وقاص تھا۔اس شخصیت کا کالا رنگ اور دبلا جسم دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ اصلی راجپوت ہے، نقلی نہیں۔

میں اپنے تصورات کو سمبھالتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔انٹرویو لینے والے تو مجھے شکل سے ہی دو ہاتھ آگے لگتے تھے۔دوسرے صاحب کی عینک دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ ہر مہینے ناک کی ہڈی نئی ڈلوانی پڑتی ہوگی۔خیر مکالمہ شروع ہوا۔پہلا سوال آیا : آپ کا نام

جی وہ۔ میں نے کہا۔

"جی وہ" لکھ لو۔ایویں کورین میڈ نام ہوگا۔ایڈیٹر نے میری بات سنے بغیر ساتھ والے کو جلدی سے کہہ دیا۔

کچھ لکھ لیتے ہو۔دوسرا سوال آیا۔

نیک لوگوں کو دشمنوں سے بھی نفع ہوتا ہے (جالینوس)

جی الف، ب ؟ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

اوئے میرا مطلب ہے کوئی عرضی، درخواست ، بیان حلفی کسی مظلوم، بے یارومددگار کی پولیس رپورٹ وغیرہ۔اس نے بھڑک کر کہا۔

ان کی ڈیمانڈ اور لہجہ دیکھ کر اندزہ ہوا کہ شاید آگے یہ سب لکھنا پڑسکتا ہے۔احتیاطاً میں نے میز پر پڑا ہوا پیپر ویٹ اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔

اچھا بتاؤ "بن لادن" اور "جونیکا لیونیسکی" میں کیا رشتہ ہے؟ یہ اس نکلی بٹ نے اپنی خوف صورت جیسا سوال داغا۔

اگر "لادن" کی جگہ "کلنٹن" ہوتا تو کچھ سوچا جاسکتا تھا مگر یہ ہی جواب بن پایا کہ جوشیدا ٹلی اور کترینہ کیف میں ہے۔

اچھا المہندس کے لئے کیا کرسکتے ہو؟ چھوٹے ناک والے نے اپنی عینک کو ہیوی ویٹ کی طرح اوپر کرتے ہوئے پوچھا۔

جناب میں ایک ویل پر موٹر سائیکل چلا کر تصویر بنا سکتا ہوں۔لکیروں سے انسان بنا کر اسے زبردستی prove, comic کرسکتا ہوں۔میر تقی میر کے کاپی رائیٹس اپنے نام منتقل کرسکتا ہوں۔سائنس فکشن میگزین میں سے ٹوٹا نکال کر اپنے نام سے پیش کرسکتا ہوں۔

Good تم ہمارے کام کے آدمی ہو۔

اچھا بتاؤ اگر میں ایک کیلے کی بیل پر سے امرود توڑ کر اسے کبڑیے کی دکان پر بیچ دوں تو میری عمر کتنی ہوگی؟

20 سال۔ میں نے جلدی سے جواب دیا۔

Amazing، تمہیں کیسے پتا چلا؟

کیونکہ جناب ہمارے ہمسائے میں ایک فارغ البال، فارغ العقل اور آدھا پاگل رہتا ہے۔اسکی عمر 10 سال ہے، اس حساب سے آپ 20 سال کے ہوے۔وہ اپنی بڑی عینک میں سے مصطفیٰ قریشی جیسی شکلیں بنا کر مجھے گھورتا رہا۔

ایڈیٹر نے کہا ؛ دیکھو تم بندے کام کے ہو، اگر اسی طرح محنت کرتے رہو تو میں تمہیں ایڈیٹر بنا دوں گا۔ویسے ایڈیٹر بنانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔آسان سی Recipe ہے۔سب سے پہلے ایک تھکا پرانا تکیہ لو، اس کی آدھی روئی نکال دو۔باقی کے درمیان میں لکڑی گھسا کر بازو اور ٹانگیں بناؤ۔ایک گاجر کی ناک لگاؤ اور کچی پنسل سے اسکی آنکھیں بنا کر مکئی کے دانوں سے اسکے دانت بناؤ۔اب اسکے ماتھے پر پوٹے مار کر سے اردو میں ایڈیٹر لکھو اور اسکے بعد اسکے شریفانہ سر پر ٹنڈ کی جگہ دھاگوں سے گن کر تین بال لگاؤ۔

اسکے بعد دور دھوپ میں رکھ کر خوشی سے اسے دیکھنا سروع کرو۔اگر اسکی شکل سابقہ ایڈیٹر سے میل کھاتی ہوئی تو مبارک ہو تم ایڈیٹر ہو۔

میٹھی چٹنی، مصالحے دار شربت

بشارت عباس میثم بخاری
وی۔سی آفس، UET, TAXILA

آوارہ اور تھکڑ کتوں کی ایسوسی ایشن نے گزشتہ روز خانپور روڈ پر UET کے مین گیٹ سے متصل ایک احتجاجی مظاہرہ کیا اور ٹائر جلا کر روڈ کو ہر قسم کی ٹریفک کیلئے بند کر دیا۔ بعد ازاں ڈاگ سنٹر کے عمر رسیدہ کتوں کی مداخلت اور ضلعی انتظامیہ سے مذاکرات کے بعد تمام مظاہرین کتے بھونکتے ہوئے (بھوں بھوں بھوں) پرامن طور پر منتشر ہو گئے۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے نمائندگان سے کتوں کے ترجمان نے بھونکتے ہوئے ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں UET کے چوکیداران سے سخت شکایت ہے کیونکہ وہ ہمارے چند کتوں کو گیٹ پر روکنے کی کوشش کرتے ہوئے پائے گئے ہیں، اگرچہ انکی یہ کوشش ہمیشہ ناکام و نامراد ہی رہی ہے اور رہے گی۔ مگر ان چوکیداران کی یہ حرکت انتہائی قابلِ مذمت اور جانوروں کے حقوق کی کھلم کھلی خلاف ورزی ہے۔ ترجمان کتے نے دھمکی آمیز اور رقت آمیز لہجے کے ملاپ میں بات کرتے ہوئے کہا اگر یہ تفریق ختم نہ کی گئی تو ہم ملک گیر ہڑتال کی کال دینگے۔ اور اگر پھر بھی ہمارے تحفظات دور نہ کیے گئے تو ہم عالمی سطح پر بھونک بھونک کر آوازیں بلند کرینگے۔ اور ہم white House میں مقیم Mr. Obama کے کالے کتے کو اعتماد میں لے کر راست اقدامات پر مجبور ہونگے۔

ایک صحافی نے جب ترجمان کتے سے یہ سوال کیا کہ آپ پر UET میں داخلہ پر کوئی قدغن ہے؟ بلکہ آپ تو campus میں بڑے دھڑلے سے گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں جیسے آپ نے یونیورسٹی کو لیز (lease) پر لیا ہوا ہے۔۔ تو ترجمان نے غرغراتے ہوئے صحافی کی طرف دیکھا اور no comments کہ کر پریس کانفرنس برخاست کر دی۔

اکثر female students یہ شکایت کرتے ہوئے پائی گئیں کہ campus میں کتے اور بلیاں بہت زیادہ ہیں۔ ہم Computer Department کے سامنے لان میں بیٹھی اپنا کام کر رہی ہوتی ہیں (تو کیا ہوا اگر ہم messaging ہی کر رہی ہوں) تو کتے اور بلیاں ہمیں پریشان کرتے ہیں۔ خاص طور پر الیکٹریکل بلاک اور لائبریری کے سامنے کا ایریا میں ہر وقت پانچ چھ عدد کتے اپنے اہل وعیال کے ساتھ موجود ہوتے ہیں، جیسے کسی دن اگر وہ نہ آئے تو ان کی absent لگ جائے گی۔ جب Female Students کو کتوں کے مظاہرے کا علم ہوا تو انھوں نے اپنی تحریری شکایت واپس لے لی۔

کیمپس میں resident students کی شکایت عام ہوگئی ہے بلکہ اتنی عام ہوگئی ہے کہ non residents students کے بھی کان پک گئے ہیں۔ اور وہ شکایت یہ ہے کہ ہمارے ہال میں net نہیں آ رہا۔

بھئی اگر ہال میں نیٹ نہیں آتا تو ڈسپنری گراؤنڈ میں آ جائیں وہاں پر آپکو والی بال کا نیٹ لگا ہوا مل جائے گا۔ ویسے بھی جو بھی ہال ہے وہ حال و بے حال ہے مطلب کہ اسکا مندا اور برا حال ہے۔ residents students کو کبھی non residents حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ آجکل non residents ان پر ترس کھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یہاں کی Tuck shop, Canteens, Cafeteria کے نرخ زیادہ ہیں، مارکیٹ کمیٹی کو فعال کرتے ہوئے اشیائے خورد و نوش کے نرخ HMC Market یا صدر پنڈی کے مساوی لائے جائیں۔۔۔۔

بدخلقی سے دشمنی پیدا ہوتی ہے اور دشمنی سے جفا کاری (امام غزالیؒ)

آپکی شکایت کا ہم نے نوٹس لے لیا ہے، بلکہ اگر آپ شکایت نہ بھی کرتے اور ہم پھر بھی نوٹس لے لیتے تو یہ از خود نوٹس کہلاتا۔۔مگر اب ہم نے شکایت کندگان کے نام ہم نے نوٹ کر لیے ہیں اب انکی خیر نہیں کیونکہ انھوں نے ہم سے خوامخواہ از خود نوٹس کا اعزاز چھین لیا۔لھذہ پہلے ہم انکی اس حرکت کا نوٹس لیں گے۔اور پھر ٹائم ہوا شکایت کا بھی ٹھیک ٹھاک notice لیا جاسکتا ہے۔

ہماری female students کیلئے مناسب جاب کا انتظام کیا جائے۔کیونکہ ہماری اکثر students جو ڈگری ہولڈر ہیں اپنے گھروں پر ویلی (job less) ہیں

(Spoke Person: Girls Students Association)

جی میم آپ اپنے فیلڈ کی جاب کی بات کر رہی ہیں تو۔۔بسم اللہ کریں آپ بیوٹی پارلر، جیولری، بوتیک، ہیر سیلون اور فیشن ڈیزائن وغیرہ میں آسانی کے ساتھ منسلک ہوسکتی ہیں۔

Semester اور Semi Sister میں فرق:

Semester ایک ایسا تعلیمی دورانیہ جس میں سٹوڈنٹس کو سر کھرچنے کا موقع بھی نہ ملے اور اگر سر کو کھجلانا انتہائی ناگذیر ہو تو وہ اپنا سر کسی دیوار کے ساتھ مار کر مطوبہ نتائج حاصل کر سکیں تو ٹھیک ورنہ سرتاپا تعلیم کے نالہ لئی میں ڈوبے رہیں۔

Semi Sister یونیورسٹیز میں پائی جانے والی ایسی لڑکی جو نہ تو آپکی Sister بن سکے اور نہ ہی friend بلکہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق آپ سے تمام notes لیتی رہے اور آپکی تیار کردہ (بلکہ net سے چھاپہ شدہ) assignments پر اپنے نام اور رولنمبر کا سٹکر لگا کر کام چلاتی رہے اور جب آپکو اسکی مدد کی ضرورت پڑھ جائے تو آگے سے چٹا جواب آئے کہ The number you have dialed is not responding at that moment او اللہ والے او کوئی ہور مہنہ کرو۔

ادب بہترین کمالات اور خیرات افضل ترین عبادت میں سے ہے (حضرت علیؓ)

مستبشرہ فاروق
10-CP

ماسی

دورِحاضر کی اہم ضرورت۔۔۔۔۔ماسی

انسانی زندگی کے لیئے ہوااور پانی لازمی جز ہیں۔لیکن آج کل کے دور میں خواتین کے لیئے ان سے بھی بڑھ کر میک آپ اور ماسی زندگی گزارنے کے لیئے ضروری ہیں۔میک آپ کے بغیر تو شاید گزارہ ہو جائے لیکن ماسی کے بغیر تو آج کل کے دور میں زندگی کا تصور بھی محال تصور کیا جاتا ہے۔اسی وجہ سے موجودہ دور میں ہر گھر میں ماسیوں کی بہت مانگ ہے اوران کے بغیر زندگی گزارنا دشوار ہی نہیں ناممکن ہے۔اپنی بڑھتی ہوئی مانگ کو محسوس کرتے ہوئے رنگ برنگی ماسیوں کے مزاج بھی رنگ برنگے ہو گئے ہیں۔ٹیلی فون پر بیگمات کی گفتگو کا موضوع ہی ماسی ہوتا ہے۔

ملازمت پیشہ خواتین تو ایک طرف گھریلو خواتین بھی ماسیوں کے دھکڑے سناتی نظر آتی ہیں۔اگر یقین نہیں آتا تو آپ کو ایک محلے کا قصہ سناتے ہیں جہاں ماسی تین دن سے نہیں آئی ہے۔

آنٹی اکبری سر تھام کر بیٹھی تھیں۔سامنے ڈھیر سارے برتن گندے پڑے تھے۔وروہ زاروقطار رو رہی تھیں کہ

کہاں ہو تم چلے آؤ محبت کا تقاضا ہے
غمِ دنیا سے گھبرا کر تمھیں دل نے پکارا ہے

منا دوڑتا ہوا آیا کہ امی امی بھوک لگی ہے۔لیکن زوردار تھپڑ آنٹی نیمنے کے گال پر رسید کیا۔اور وہ صرف یہ کہتے ہوئے روتا ہوا گلی میں نکل گیا کہ 'میرا کیا قصور تھا'۔

پرلی طرف آنٹی شکورن کا گھر ہے۔وہ بوکھلائی ہوئی ٹہل رہی تھیں۔انکے میاں ان پر برس رہے تھے کیونکہ آنٹی شکورن نے اپنے میاں کو دفتر جانے کے لیئے اپنے بیٹے کے کپڑے دے دیے تھے کیونکہ وہی صاف تھے۔کرم نوازی لوڈشیڈنگ نے کی اندھیرے میں کپڑے پہن کر جب وہ کمرے سے باہر نکلے تو پتلون نکر بنی ہوئی تھی۔شرٹ پھنسی ہوئی تھی۔

سامنے والا گھر آنٹی اصغری کا تھا۔وہ بہت سیانی اور الفاظ کی اصنام گری سے دوسروں کو متاثر کرنے کی ماہر تھیں۔لیکن اس وقت وہ مجرموں کی طرح اپنے میاں کے سامنے دخترانِ مشرق کی زندہ مثال بنی کھڑی تھیں۔میز پر جلے ہوئے توس، جوشاندہ نما چائے رکھی ہوئی تھی۔اور آنکل آنٹی کی ہوم اکنامکس کی ڈگری کو چولھے میں جھونکنے کی بات کر رہے تھے۔

آنٹی کی صبح کی نیند کیا پوری ہوتی الٹی صلواتیں سننی پڑ رہی تھیں اور اس وقت انہیں اس وقت انہیں ان دنوں کی یاد تڑپا رہی تھی جب وہ صبح دیر تک سپنوں کی دنیا کی سیر کرتی تھیں اور ناشتہ ماسی بناتی تھی۔

جس بیماری کا سبب معلوم ہے اس کا شفا بھی موجود ہے (بقراط)

پھر اچانک قدرت کو رحم آ گیا۔سب کی دعائیں رنگ لے آئیں۔اور منا دوڑتا ہوا آیا کہ امی امی ماسی میراں آ گئی۔تینوں آنٹیاں بیک وقت اپنے گھروں سے استقبال کے لیئے نکل آئیں اور ماسی میراں دنیا کی فکروں سے بے خبر پرانده لہراتے ہوئے اور گنگناتے ہوئے آ رہی تھیں 'او چیاں مجاں جان والی آت گئی'۔تینوں بیگمات نے ماسی میراں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

اور تینوں کی کوشش تھی کہ اسے اپنے گھر لے جائیں۔کہ ماسی میراں تینوں کو دھکا دیتے ہوئے مخاطب ہوئی 'اج تسی رل کے میری باں توڑنی ہے ساں تو لینڈ دو کوئی پانی وانی دو'

ایک بیگم ماسی کی تواضع کے لیئے شربت لے ائی تو ماسی نے انکار کر دیا۔پھر دوسری بیگم چائے لے آئی تو ماسی نے چائے سے بھی انکار کر دیا کہ گرمی میں چائے سے تو کلیجہ سڑتا ہے۔پھر تیسی بیگم پیپسی لے آئی تو ماسی رضامند ہوگئی اور پی کر ڈکار لے کر تینوں سے مخاطب ہوئی کہ اس ڈکار والی بوتل وچ سواد ہی سواد ہے۔دل مانگے ہور۔

آخر کار تینوں کے بار بار پوچھنے کے وہ تین دن سے کیاں غائب تھی ماسی مخاطب ہوئی کہ تم لوگوں کے گھر کام کر کے میری سکن خراب ہوگئی اور پھر میں ڈپریشن کے عارضے میں مبتلا ہوگئی۔پھر میرا بندہ کہنے لگا تو کچھ روز کام پر مت جا کوئی فشل وشل (فیشل) کروا۔پھر بیوٹی پالر میں مجھے ایک بڑے افسر کی بیگم ملی انہوں نے مجھے کہا کہ انہیں ماسی کی سخت ضرورت ہے۔

اور انہوں نے میری تمام تر ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری لے لی۔انہوں نے مجھے منہ مانگے پیسے دیے۔Q-Mobile دیا۔کلسک (کلاسک) لان بھی دیا۔پک اینڈ ڈراپ بھی انہی کے ذمے۔

پھر اچانک ماسی کے موبائل پر کسی کی کال آئی گئی جسے وہ نہایت شگفتگی سے کہہ رہی تھی کہ باجی مجھے اس ایڈرس پر لینے آ جاؤ۔پھر وہ تینوں کو یہ کہہ کر الوداع کر گئی کہ تم لوگ مجھے وارے نہیں کھاتے، میری بیگم صاحبہ مجھے لینے آ رہی ہیں اور تینوں صرف اس کا منہ دیکھتی رہ گئیں کہ جانے والی ماسی کو کون روک سکتا ہے۔

ارے او بے مروت، ارے او بے وفا
کیا یہی ہے وفاؤں کا صلہ ؟؟؟؟

عقل جس جگہ کامل ہوگئی حرص وشر ناقص ہوگا (افلاطون)

گوشہء سخن (حصہء غزل)

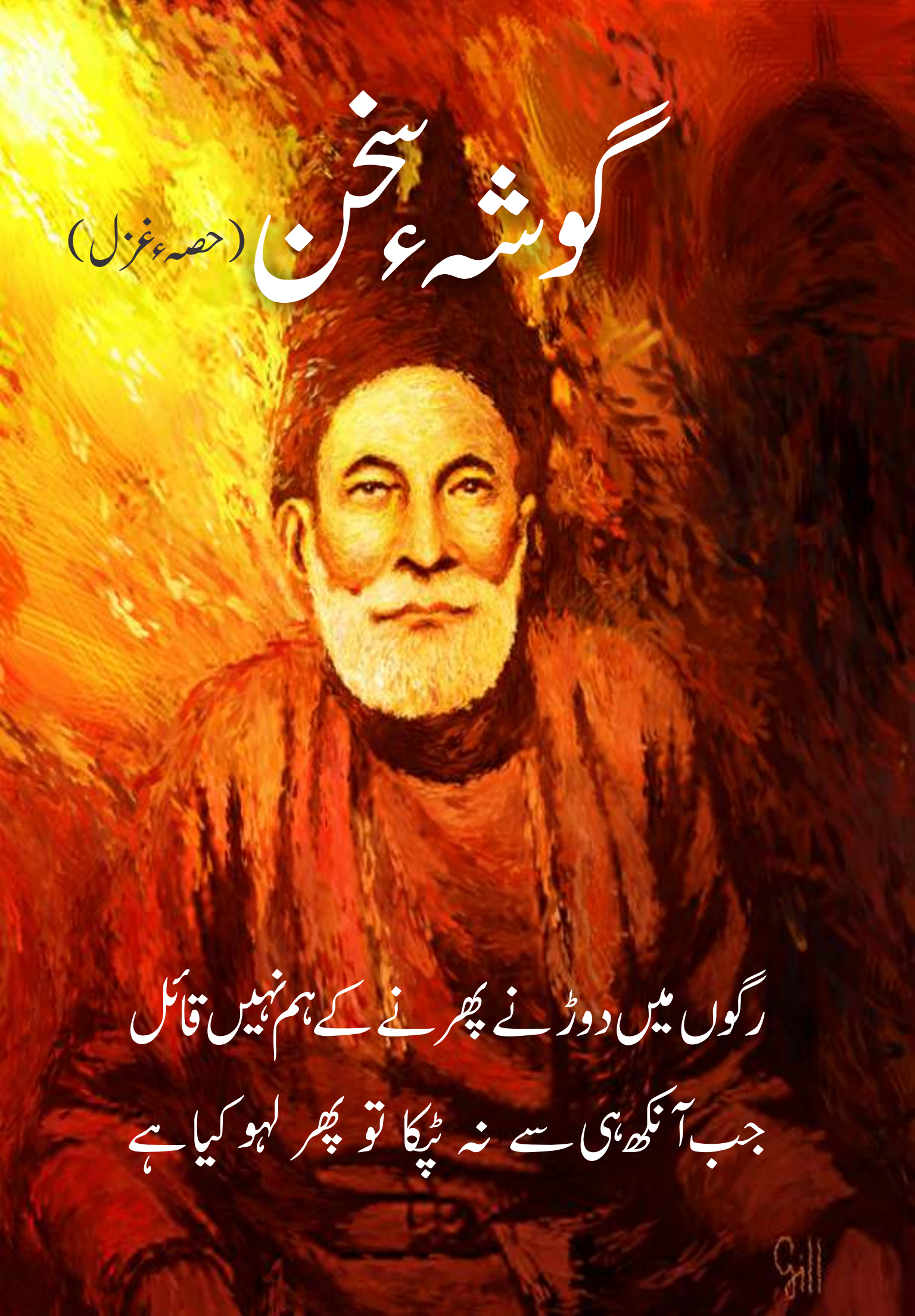

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

حمدِ باری تعالیٰ

تو رحمان ہے تو رحیم ہے
تیری ذات سب سے قدیم ہے
میرے شعور سے تو ماوراء
میری سوچ سے بھی قدیم ہے
مجھے تیرے پاس ہے لوٹنا
تو بخش دے تو کریم ہے

میری سوچ بھی تو نماز بھی
حقیقت بھی تو غماز بھی
تو جہاں ہے پنہاں وہیں عیاں
عجیب ہے تیرا انداز بھی
نہیں ہے کوئی تیرا شریک
تو خالق بڑا بے نیاز بھی

ہر اک چمن میں تیرا جمال
یہ شمس و قمر تیرا کمال
چرند پرند جن و انساں
تری تخلیق ہے بے مثال
روزو شب اور ماہ و سال
یکتا ہے تیرا حسنِ خیال

مجھے روشنی کا مسافر بنا
راہ نیک لوگوں کی مجھ کو چلا
پناہ مانگتا ہوں شیطان سے
حاسدوں کے شر سے بچا
گناہ بخش دے تو رحمان ہے
قبول کر تو میری دعا

جو شخص جھوٹی قسم کھائے اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے (حدیثِ نبوی ﷺ)

محمد شبیر چوہان

نعتِ رسول مقبول ﷺ

میرے درد کا درماں آپ ہی تو ہیں
سب حقیقتوں میں عیاں آپ ہی تو ہیں

آپ نہ ہوتے یہ کائنات نہ ہو پاتی
باعثِ تخلیقِ جہاں آپ ہی تو ہیں

نور آپ کا بناسب سے پہلے
روحِ زمین و آسمان آپ ہی تو ہیں

ساقیِ کوثر، شافعیِ محشر، رحمتِ دو عالم
وہ جسے کہوں بخشش کا ساماں آپ ہی تو ہیں

دھلی جس سے گردِ ظلمت سارے زمانوں کی
وہ آبِ رحمت وہ باراں آپ ہی تو ہیں

بلند ہمتی ایمان کی علامت ہے (حدیثِ نبوی ﷺ)

توقیر خالد لاریب

بچھڑتے لمحے ہونٹوں پر دعا ہونا
بہت مشکل ہے اپنوں سے جدا ہونا

ہے کس دورِ بغاوت میں جنم میرا
میں نے دیکھا ہے بندوں کا خدا ہونا

اِشارہء فنائے گُل ہی سمجھیے
ہوا میں خوشبو کا ذائقہ ہونا

مجھے کتنی بُرائی سے بچاتا ہے
سعئیء رزق میں میرا لگا ہونا

کسی کو چھوڑنے کا وقت ہوتا ہے
کسی کے ہاتھ پر رنگِ حنا ہونا

بری عادت پر غالم آنا کمال فضیلت ہے (حضرت علیؓ)

عطا مہروز
10-CE-05

سمندر سے بھی گہرے ہوتے ہیں کچھ لوگ
باتوں میں مگر کھرے ہوتے ہیں کچھ لوگ
سمجھتے ہیں زمانے والے بے درد مگر
دردِ دل سے گہرے ہوتے ہیں کچھ لوگ
بہاروخزاں سے تعلق تو رکھتے ہیں مگر
حالات سے ڈرے ہوتے ہیں کچھ لوگ
دیکھ کر چلتا پھرتا آپ زندہ نہ سمجھیں ہم کو
جیتے جی بھی مرے ہوتے ہیں کچھ لوگ
مقصدِ حیات کو پا لیتے ہیں خوش نصیب
یونہی دنیا دنیا سے لگے ہوتے ہیں کچھ لوگ
ساحل پسند نہیں ہوتے سب ساحل آشنا
تلاطم خیز موجوں سے لڑے ہوتے ہیں کچھ لوگ
ہر ایک سے بے جا مذاق نہیں اچھا عطا
خوش مزاجوں میں بھی دل جلے ہوتے ہیں کچھ لوگ

عبدالوہاب
12-TE-91

زباں پھسلی آیا ترا نام بات بات میں اکثر
اُنہیں خوش دیکھا ہے ہم نے خیالات میں اکثر

اپنی آنکھوں سے پلانے والے .....
اب مجھے ملتے ہیں خرابات میں اکثر

فرقت کے دن گزر گئے اب جو سوچوں تو
ہوتا ہے ترا ہاتھ مرے ہاتھ میں اکثر

عبث تجھ کو گلی کوچوں میں کرتا رہا تلاش
پایا ہے تجھے میں نے اپنی ذات میں اکثر

کوکب خیالِ یار کو جب بھی جُدا کیا
پایا ہے خود کو میں نے ظلمات میں اکثر

اسداللہ زاہد
12-EE-92

شب ہجراں میں اک نقش صبح رہتا ہے
دل ناداں میں اک دیا جلا رہتا ہے
آزاد پنچھی ہے جانے کب لوٹ آئے
اس آس پہ اک دروازہ کھلا رہتا ہے
صبح کہتی ہے کہاں ہوتے ہو صاحب
شب کو ہر شب مجھ سے گلا رہتا ہے
تیری عادت ہے ہنس کے گزر جانے کی
اور میخانے میں اک کہرام مچا رہتا ہے

سب ہی خود غرض ہیں کوئی تو یہ پوچھے
کیوں گلی میں تنہا زاہد کھڑا رہتا ہے

شاہین احمد
11-TE-170

حرف ملتے اگر ہم کو، نسبت کرتے
پل باندھتے لفظوں کے، عمارت کرتے
پوشیدہ وصف تھے ایسے کہ مت پوچھ
محبت اگر نہ کرتے، سیاست کرتے
دیدہ وروں کی پہچان نہیں ممکن
چہرے لفظ اگر ہوتے، شناخت کرتے
تیرے بسمل کو سخن فہمی اگر ہوتی
غزل کہتے، نظم لکھتے، کتابت کرتے

سب سے بڑا بزدل وہ ہے جو موت سے ڈرتا ہے (ارسطو)

09-EE

ضیاءالرحمٰن

حالِ دل دیکھ میرا مجھ کو ستانے والے
بن کے بیٹھے ہیں تماشائی زمانے والے
اتر کے دیکھ میرے دل کے بیابانوں میں
اپنے ہونٹوں پہ تبسم کو سجانے والے
میرے محبوب کی دے دینا مجھ کو خبر
اے مسافر کوئے محبوب کو جانے والے
میرے دامن میں شرارے ہی شرارے ہیں
اور ہیں مانگ میں پھولوں کو سجانے والے
اک عرصہ سے جلتا ہوں تیری فرقت میں
آ بھی جا دل کے بیابانوں کو بسانے والے
میری یادوں سے چھٹکارا کبھی نہ پاؤ گے
بھول پائیں گے نہ ضیاء بھلانے والے

11-IE-47

محمد حسن سرفراز

کبھی سُکھ نہ پایا کسی نے جہاں میں
ملے بھی خوشی کیوں غموں کے مکاں میں
زمانہ سِتم گر، اِدھر یار ظالم
بتاؤ کہ جاؤں تو جاؤں کہاں میں
بہت دِن ہوئے ایک خُوگر انا کا
پڑا ہے برابر کسی آستاں میں
سرِ راہ لُٹتے تو حیرت نہ ہوتی
مگر ہم لُٹے کوچۂ دلبراں میں
اگر اِک نظر دیکھ لے تُو تو آؤں
جبیں پر گھسٹ کر ترے آستاں میں
ترے عشق کی بَرکتیں ہیں یہ ساری
تہی دست ہے محترم کارواں میں
ضعیفی عطا ہے غمِ جانجاں کی
وگرنا حسنؔ ہوں ابھی تو جواں میں

12-EE

محمد احسن عباسی

آج پھر اِک رات ہجر کی گزاری ہے
پھر پروانے نے شمع پر جان واری ہے
گزرے جو پل ، محبوب یاد میں تیری
وہی میرا سرمایہ، وہی دولت ہماری ہے
میں اپنا درد بیاں کروں تو کیسے؟
کہ جیتی بازی اِک پل میں ہاری ہے
محبت کیا ہے؟ فقط اتنا کہوں گا جاناں
سب غم میرے ، جو راحت ہے تمہاری ہے
بس کرو کہ رو پڑیں گے اہل سخن احسنؔ
ہر اک نے یہاں عاشقی میں عمر گزاری ہے

غلے کو روک کر بیچنے والا ملعون ہے (حدیثِ نبوی ﷺ)

وجاہت عباس — 10-ENV-53

بہت پرے تھا مگر شناس رکھتا تھا
وہ قافلے سے ملنے کی آس رکھتا تھا
اَنا وخودداری اُسے درپیش تھی ورنہ
سوال آنکھوں میں لبوں پہ پیاس رکھتا تھا
پہن رکھے ہیں بدن پہ چیتھڑے جس نے
کبھی وہ شخص بھی مخمل کا لِباس رکھتا تھا
جو میری ذات کو نیچا دِکھا رہا ہے، کبھی
ہماری نسبت لبوں پہ، سپاس رکھتا تھا
پھیلائے سینہ جو محوِ غرور دِکھتا ہے
وہ ہم سے ہاتھ مِلانے کی آس رکھتا تھا
آ کے ہم سے اکثر لپٹ لیا کرتا۔۔۔۔۔
کبھی وہ شخص جب خوف وہراس رکھتا تھا
ہمیں جو دیکھ کے نظریں چُرا رہا تھا وجیؔ
کبھی وہ شخص ہمیں دل کے پاس رکھتا تھا

علی حسنین — 10-CE

لوگ سوئے ہوئے فتنوں کو جگا دیتے ہیں
لَو چراغوں کی سرِ شام بڑھا دیتے ہیں
رات بھر جاگتے رہنا کی صدائیں دے کر
صُبح تک شہر کے لوگوں کو سُلا دیتے ہیں
جانتے ہیں کوئی سیلاب ہے آنے والا
پھر بھی اِک ریت کی دیوار اٹھا دیتے ہیں
اِتنے وابستہء گُلشن ہیں کہ گُلشن کی طرح
لوگ گلدان میں کانٹے بھی سجَا دیتے ہیں
چیز کڑوی ہے مگر دُھوپ سے بچنے کے لیے
نیم کا پیڑ بھی آنگن میں لگا دیتے ہیں
غم گُسارو! تمہیں معلوم ہے یہ رسمِ جہاں
صُبح ہوتے ہی چراغوں کو بُجھا دیتے ہیں
پہلے دِیوانہ بنا دیتے تھے لوگوں کو حسیں
آج کل شہر کے حالات بنا دیتے ہیں

عائشہ سلیم — 11-SE-171

تمہارے حال سے جدا کچھ میرا حال نہ تھا
یوں چلے جاؤ گے تم یہ میرا خیال نہ تھا
تم کو لگتا تھا کہ میں رہ نہ سکوں گی لیکن
تمہارے بعد بھی جینا میرا محال نہ تھا
سنا ہے آج کل تم بھی تڑپ رہے ہو بہت
اب میں سمجھی یہ ہجر میرا ہی زوال نہ تھا
تو نہ غمگین ہو عاشیؔ، وہ تیرا ہو نہ سکا
اس کو بھائے جو تیرے پاس وہ جمال نہ تھا

محمد عثمان خان — 11-CP-61

خواہش گفتگو ہے، موضوع گفتگو موجود نہیں
گرچہ چاہِ منزل ہے، مگر جستجو موجود نہیں
خدا کے احکام پر خواہشیں غالب آگئیں
تبھی تو آج انجیل ہو بہو موجود نہیں
ڈھونڈنے اسے طور پر جاتے کیوں ہو
کیا خدا تیرے چار سو موجود نہیں
عجب حالتِ تماشائے جنوں میں ہیں ہم
نماز پڑھنے چلے ہیں اور وضو موجود نہیں
نہ گل میں ہے رنگ نہ بہار میں خوشی
کیا لطف زندگی کا جب تو موجود نہیں

فیاض خدا کا دوست ہے (حدیثِ نبوی ﷺ)

سیّدہ اسماء گردیزی

12-SE-58

یہ جو پُر شِکستہ ہے فاختہ، یہ جو زخم زخم گُلاب ہے ہے داستان
میرے عہد کی جہاں ظلمتوں کا نصاب ہے
جہاں ترجمانی ہو جھوٹ کی، جہاں حکمرانی ہو لُوٹ کی
جہاں بات کرنا مُحال ہو، وہاں آگہی بھی عذاب ہے
میری جان ہونٹ تو کھول تُو ، کبھی اپنے حَق میں بھی بول تُو
یہ عجب ہے تِری خامشی، نہ سوال ہے نہ جواب ہے
سرِ راہ چراغ جلے گا کیا، کوئی منزلوں کو چلے گا کیا
ترا دِل ہے ابھی بُجھا ہوا، تیری آنکھ میں ابھی خواب ہے
وہی آب آب ہیں آبلے ، وہی فصل فصل ہیں فاصلے
وہی خار خار ہے راہ گزر ، وہی دَشت دَشت سرَاب ہے
وہی بام ودر ہیں جَلے ہُوئے، وہی چاند چہرے ڈھلے ہُوئے
وہی صبحِ کُوئے ملال ہے، وہی شام شہر خواب ہے
مُجھے تُجھ سے گِلہ نہیں، کہ میں خود ہی تُجھ سے مِلا نہیں
میری زِندگی بھی عذاب ہے، تیری زندگی بھی عذاب ہے

اقراء کرن

11-TE-166

حیا محبت کے آسمانی نصاب میں ہے
حیا حمیت کے مسکراتی کتاب میں ہے
حیا رخِ برگِ لالہ وگُل میں موجزن ہے
حیا کلی کے بدن کرفتہ شباب میں ہے
حیا ستاروں کی جلملاتی حسیں قبا میں
حیا سرِ شام ڈوبتے آفتاب میں ہے
حیا نہ ہو تو وجودِ زن میں عیوب لاکھوں
حیا محبت کا معجزہ ہے، حجاب میں ہے
نیا زمانہ ،حیا میں کیا رنگ بھر رہا ہے
حجاب پیروں میں اور عورت عذاب میں ہے
جو بے حجابی کو بے حیائی نہیں سمجھتا
شرابِ مستی میں گم اور شہر سراب میں ہے

عثمان علی

10-ME-142

تیری آنکھ میں یہ سر خیاں ، تجھے رتجگوں سے پیار کیوں
تیرے گال تو ہیں ازل سے تر تجھے رتجگوں سے پیار کیوں
میں بھٹک رہا ہوں ادھر اُدھر ،مجھے نقشِ پا کی تلاش ہے
کوئی کاش اتنا سمجھ سکے مجھے راستوں سے پیار کیوں
تیرا انگ انگ ہے دھوپ سا، تیری بات بات ہے اوس سی
تجھے سورجوں سے ہے کام کیا ، تجھے بادلوں سے پیار کیوں
میرے غم کی تال پہ کان دھر ، میرے ماہ و سال پہ ہاتھ رکھ
میری دھڑکنیں بھ تو سن کبھی تجھے پتھروں سے پیار کیوں

عقلمند وہ ہے جو اپنی زبان کو دوسروں کی مذمت سے بچائے رکھے (جالینوس)

گوشہء سخن (حصہء نظم)

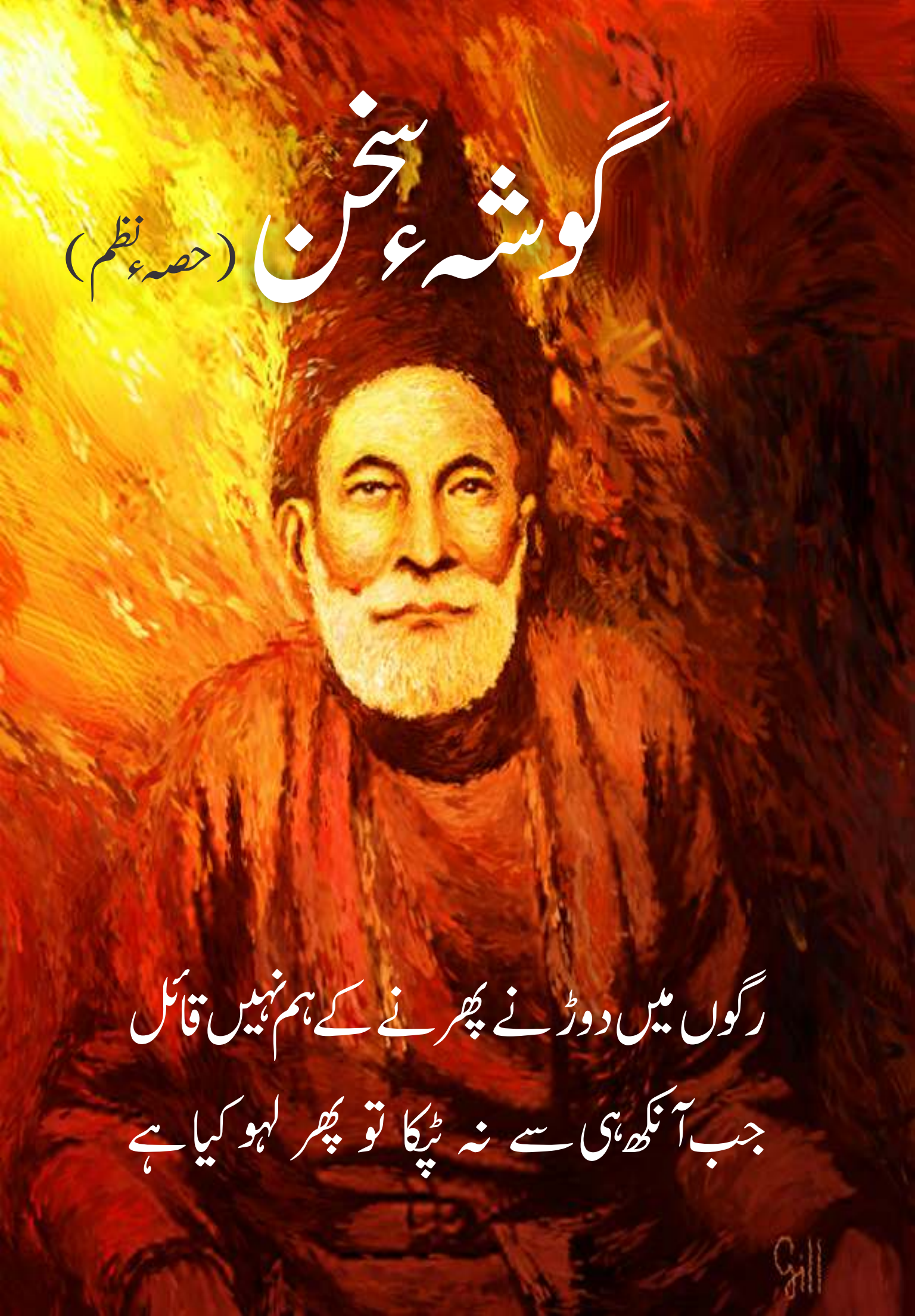

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

علی ارسلان | 09-EE

''قائد کے نام''

کیا ہو گیا تیرے خوابوں کا انجام تیرے بعد
اب تو لگتے ہیں سویرے بھی ہمیں شام تیرے بعد
اے حقیقت مجھے تیری ذہانت کی قسم
آج پھرتے ہیں بے رہبر تیرے عوام تیرے بعد
بندوں کی طرح آزاد ہیں جسم و جاں مگر
سوچ وفکر ہیں اغیار کے زیرِ دام تیرے بعد
ہمارا ہر عمل ہے متقاء تیرے اصولوں سے اے قائد
اس لیے کھو بیٹھے ہیں ہم اپنا مقام تیرے بعد
کہاں سے لائے گی زمین اب تجھ سا جوہر تراش کر
روتے ہیں میری سیاست کے دروبام تیرے بعد
قبلہ بدل دیا ہے رہبروں نے قوم کا
ہمیں درپیش ہیں رنج و آلام تیرے بعد
اپنا لیا بزرگوں نے اقوامِ مضرب کا نظام
رہ گیا بچوں کی کتابوں میں تیرا نام تیرے بعد

عروج منظور | 09-TE-19

غالب UETian vs

آخری رات پڑھ کے سمسٹر پاس کرتے ہو
میرے یارو! تم بھی کمال کرتے ہو
کرلوں جو تم سے پڑھائی پہ بات
تو آنکھیں دکھا کے ہم پہ جلال کرتے ہو
کبھی جو غلطی سے پڑھنے بیٹھ جاؤ
Theories کا برا حال کرتے ہو
Bunk مارنے کے بہانے ہیں ہزار
پھر کیوں Society meeting کی بات کرتے ہو
Route پہ نکلتے ہو صدر کے لئے
جیب میں ٹکا نہیں Cinepax کی بات کرتے ہو
سوچ سمجھ کے رکھنی تھی Pre-Engineering ایف ایس سی میں
اب کس بات کا اتنا ملال کرتے ہو
تم تو جانتے ہی ہو UETians کو
اب مجھ سے کیا سوال کرتے ہو

ملجا اسلم

پختہ عمر کی کچی محبت

سفر کی ایک طویل تھکن
پھر راحت کا ایک سامان
پھر جدائی کا سخت عذاب
ایسی ہی تو ہوتی ہے
پختہ عمر کی کچی محبت

طلب علم سے شرم مناسب نہیں کیونکہ جہالت شرم سے بدتر ہے (افلاطون)

ٹیکسلا

پتھروں کے اس شہر میں
کہاں سے لاؤں وہ باوفا دل
جو چاہتوں کی کتاب لکھے
محبتوں کے نصاب لکھے
میرے چہرے پر سوال ہیں جو
کوئی جو ان کے جواب لکھے
بتاؤ تم ہی، کہاں سے لاؤں
وہ دل، جو چہرہ شناس بھی ہو
جو مسکرائے، اداس بھی ہو
جو جان لے یہ ہنسی ہے جھوٹی
اور ضبطِ جاں کو عذاب لکھے
جو حقیقتوں سے اٹھائے پردہ
اور خواہشوں کو سراب لکھے
کوئی تو ہووہ وفا کا پیکر
جو میرے دکھ کا جواز سمجھے
جو میرے اشکوں کا راز سمجھے
اور آنکھ کو جو سحاب لکھے
مگر بتاؤ کہاں ملے گا
پتھروں کے اس شہر میں !!!

حکیم اس کو کہتے ہیں جو باوجود دولت رکھنے کے ستم نہ کرے (جالینوس)

کبھی جو چمن کا حال پوچھو
کبھی جو تم کو یاد ستائے!!
تو یاد رکھنا
چمن وہ سارا نہیں رہا ہے
برگد کا وہ اونچا پیڑ
منہ کے بل آ گرا ہے
اسے یہ شاید نہیں پتا تھا
پرندوں کی پرورش میں
چلچلاتی دھوپ میں
چلنے کا صلہ نہیں ملتا
انہیں جب اڑنا آتا ہے تو
پیڑ کو ڈالیاں جھکا کے
بڑی ہی عاجزی کیساتھ
عمر بھر کی جمع پونجی
یکلخت گنوانی پڑتی ہے
تتلیوں کے رنگ بننے میں
روشنیوں کے سمٹنے کا
بدلا کون کب دیتا ہے؟
تتلیاں جب بڑی ہو جائیں تو
پھولوں کی آغوش سے انکو
رخصت ہونا پڑتا ہے
وہ جس بلبل کی چہکار سننے کو
پہروں جاگ کے گزارے ہوں
اسے جب اڑنا آ جائے تو
بوڑھے شجر کو
''بابا آپ چپ رہیں زمانہ بدل گیا ہے''
کا طعنہ سننا پڑتا ہے
یہ جو تنے میں دراڑ آئی ہے
تو دکھ کیسا؟
شکوہ کہاں کا؟
زمانہ بدل گیا ہے نا؟
یہاں جن کو اڑنا آ جائے تو
گھر چھوڑ کے وہ پھر اڑ جاتے ہیں
شجر کی زندگی ویران کر کے
بڑھاپے کی آندھی میں چھوڑ جاتے ہیں
اور یہ سانحہ سب سے بالاتر ہے
کہ زمانہ بدل گیا ہے
زمانہ بدل گیا ہے

All this madness of the world is due to ecstasy of love (WILLIAM SHAKESPEAR)